طلوعِ اسلام

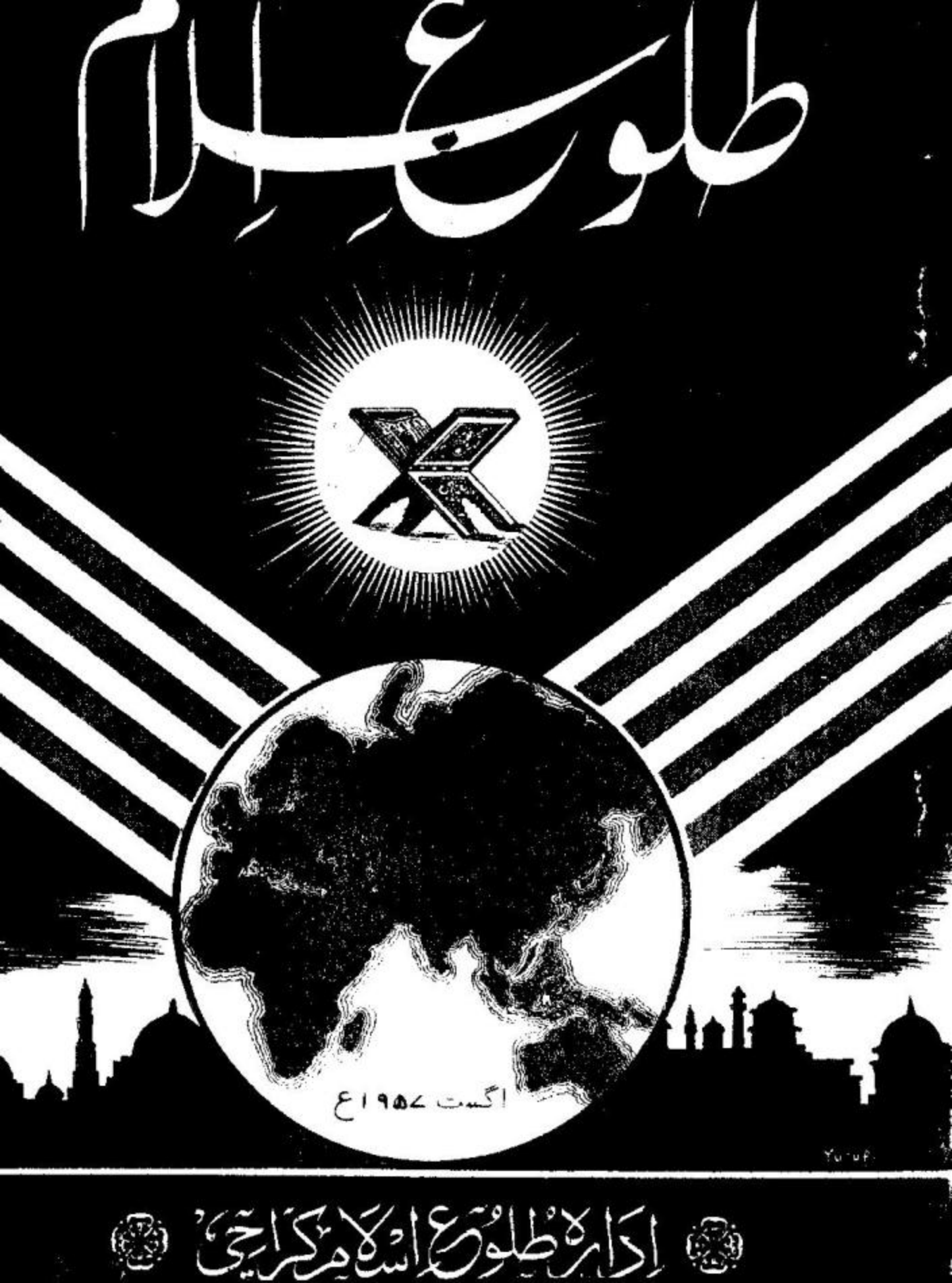

اگست ۱۹۵۷ء

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام کراچی

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر:- ۴۱۴۸۸
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ:- آٹھ روپے	ہندوستان اور پاکستان سے	خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
غیر ممالک سے سالانہ:- ۱۴ شلنگ	بارہ آنے	۱۵۹/۳- ایل پی ای سی ایچ ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

جلد ۱۰	اگست ۱۹۵۷ء	نمبر ۸

فہرست مضامین

لمعات ۲—۸

یہ زمین کس کی ہے؟ ۹—۲۴

مجلسِ اقبال ۲۵—۳۵

قرآنی معاشرہ ۳۶—۳۹

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

بے ضد کی بات اور.... ۴۱—۴۵

باب المراسلات (شیعہ حضرات کی نماز) ۴۶—۴۸

نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے! ۴۹—۵۳

ایک "مغضوب علیہ" قوم کے کارنامے ۵۴—۵۶

اسلام کی سرگزشت ۵۷—۶۴

چناپس لیشیں ور اور اُن کی جماعت ۶۷—۷۱

(محترم پرویز صاحب)

رابطۂ باہمی ۷۳—۷۴

(سکریٹری مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام)

پیشگی خریداران ۷۴—۷۵

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

آغاخانی فرقہ ۷۷—۷۹

اشتہارات ۴۰، ۶۵، ۶۶، ۷۲، ۷۵، ۷۶، ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۴ر اگست

(اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبا) (۱۷/۱۴)

۱۴ر اگست پھر آرہا ہے اور پھر ہم آزادی کا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اگر ۱۹۴۷ء کے اولین جشن کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ہمارا گیارھواں جشنِ آزادی ہوگا۔ اوروں کے نزدیک جشنِ آزادی کی سالانہ تقریب جلسوں اور جلوسوں، دعوتوں اور ضیافتوں، میلوں اور ہنگاموں کی تقریب ہوگی لیکن ہمارے نزدیک یہ تقریب درحقیقت ہمارا یومِ احتساب (Stock-Taking Day) ہے جس میں ہمیں جائزہ لینا چاہیئے کہ ہم نے گذشتہ سال سے اس وقت تک، بلکہ اولین یومِ آزادی سے آج تک کیا کیا اور ہمارے لئے کیا کچھ کرنا باقی ہے۔

ہم نے دو سال قبل (جشنِ آزادی ۱۹۵۵ء کی تقریب پر) جو تاثرات قلمبند کئے تھے انہیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے دورِ آزادی کا ہشت سالہ محاسبہ تھا۔ آپ پہلے اسے دیکھیئے اور پھر آگے بڑھیئے۔

حکیم الامت علامہ اقبال، تاریخِ انسانی کے بالغ نظرانہ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ

> عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر پوسس ہو۔۔۔۔
> بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پا جائے۔

نیز

> عالمِ بشری کے لئے سوائے نظامِ اسلامی کے اور کوئی واحد اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشری

کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔

عالم بشریت کے لئے قرآن پر مبنی واحد اجتماعی نظام کو بطور منزل سامنے رکھ کر علامہ اقبال نے پہلا قدم اٹھایا اور ایک ایسے خطہ کے حصول پر زور دیا جو اس عالمگیر تجربے کے لئے بطور معمل کام دے سکے۔ چنانچہ آپ نے ملت کے سامنے اس مملکت پاکستان کا تصور پیش کیا جس کا

اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔

انھوں نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ

اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے اور اس کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

مسلمانان برصغیر کی جو تقدیر اقبال کے کارگہ فکر سے نقش پذیر ہو کر نکلی تھی اس کے عملی حصول کے لئے جس تحریک کی ضرورت تھی، اس کی قیادت کے لئے آپ کی نظر انتخاب قائداعظم پر پڑی۔ چنانچہ مسلمانوں کی قسمت ان کے ہاتھ سونپنے سے پہلے انھیں آپ نے بتا دیا کہ

اس وقت حالت یہ ہے کہ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو۔۔۔۔۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ نشوونما دیا جا سکتا ہے۔

قائداعظم بھی جنھیں اقبال نے مسلمانوں کی قیادت کے لئے منتخب کیا اور جنھوں نے پاکستان حاصل کر کے دکھا دیا۔ یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات ایسے نظامِ معاشرت میں ہے جو قرآن کے اصولوں پر مشتمل ہو۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں آپ نے حیدرآباد میں فرمایا

میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا معاشی غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

یہ تھے وہ محرکات جنھوں نے مسلمانوں کو دنیا بھر کی مخالفت کے علی الرغم اس موقف پر قائم کر دیا کہ مسلمان بحیثیت مسلمان ملتِ واحدہ ہے اور اسے اپنی معاشرت کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے جو اجنبی اثرات سے پاک ہو اور جسے وہ آزادانہ قرآنی تعلیمات کا

گہوارہ بنا سکیں کتنی پاک تھیں یہ امنگیں اور کتنی حسین تھیں یہ آرزوئیں۔ شاید انہی کا صدقہ تھا کہ خلافِ توقع اور دیکھتے دیکھتے کرۂ ارض کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آگئی کتنی بڑی تھی یہ کامیابی۔ وہ قوم جو کوئی نوے سال پیشتر دولت و حشمت سے اس قدر محروم کر دی گئی تھی کہ اس کی زندگی تک معرضِ خطر میں پڑ گئی تھی۔ اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس امت کی اجل کا وقت آ پہنچا ہے وہی قوم ایک مملکتِ جدیدہ کی مالک بن رہی تھی۔ ایسی مملکت کی۔ الگ جس کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک دوسرے مدینہ کی تھی کہ یہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر اور تصورات کی تشکیل بے روک ٹوک اور بلا خوف و خطر کر سکتے تھے۔

قائد اعظم جو اس قوم کو ایک فرعون نہیں متعدد فرعونوں کے چنگل سے نکال کر اس نئی دنیا کے امن و سلامتی میں لے آئے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی وہ چل بسے تو عجیب فرا تفری کا دور شروع ہوا۔ اس گھر کی حالت بعینہ وہ ہو گئی جو ایک بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد نا خلف اولاد کے ہاتھوں ہو جایا کرتی ہے نام نہاد آزادی کی زندگی کو دیکھا جائے تو پاکستان قرونِ وسطیٰ کا وہ دربار نظر آتا ہے جس میں بادشاہ کے مرجانے کے بعد سازشوں کا جال بچھ گیا ہو۔ اقتدار کی اس کشمکش سے خانہ جنگی کی وہ صورت پیدا ہوئی کہ مقاصد کی تکمیل تو ایک طرف سرے سے مملکت کی برقراری مخدوش نظر آنے لگی۔

حصولِ پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہونا چاہیئے تھا کہ جس قرآنی نظام معاشرت کے تجربے کے لئے اس خطہ ارض کو حاصل کیا گیا ہے اس کا خاکہ کیا ہے اور اس میں کیسے رنگِ عمل بھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک تو اس منفرد ملک کی پیدائش ہی نے اس کے لئے ایسے گونا گوں خطرے پیدا کر دیئے کہ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ دوسرے قائدینِ پاکستان مہمات امور سے ہٹ کر ذاتی اقتدار کے حصول میں منہمک ہو گئے جس سے مولفعات راہ ناقابلِ عبور بن گئے۔ چنانچہ آزادی کے آٹھ سالوں میں ہمارے نام نہاد دستور سازوں نے مطلقاً یہ کوشش نہیں کی کہ اسلامی اصولوں کو مترتب و مکمل کریں تاکہ ان کے مطابق مملکت کا دستور تیار کیا جا سکے۔ ان کا ایسا کچھ از خود نہ کرنا شاید اس خیال سے قابلِ فہم تھا کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے لیکن جو چیز بالکل ناقابلِ فہم اور ہر طرح ناقابلِ معافی تھی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے اقبال کے اس مکتبِ فکر سے ذرا بھی استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو قرآنی اصولوں کی تشکیلِ نو میں مصروف تھا۔

جب آئین سازانِ پاکستان نے نورِ قرآنی کی تمام راہیں بند کر دیں تو رجعت پسندی، دقیانوسیت اور جہالت کی تاریکی پھیلتی گئی۔ اس فضا میں ملّا آگے بڑھا۔ اس نے مذہبی تقدس کا رعب دیگر تمام لیڈروں کے عیب گنوائے اور خود مسندِ اقتدار کی طرف بڑھا۔ اسلام سے نابلد اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں الجھے ہوئے اربابِ اقتدار ملّا کی پیش قدمی کو کہاں تک روک سکتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۵۲ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی سے متعلق سفارشات سامنے آئیں تو اس میں، محض سیاسی اعتبار سے ملکی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا تھا بلکہ قانون سازی کا آخری اختیار ملّا کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ملاؤں کی مجلس ہی یہ فیصلہ دے سکتی تھی کہ کوئی قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ حالات یہاں تک بگڑ چکے تھے کہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔ انھوں نے ناظم الدین حکومت کو برطرف کر دیا جو نظم و نسق کے اعتبار سے ملک کو تباہی کے غار تک لے آئی تھی اور مذہبی لحاظ سے ملّا کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

یہ اقدام مثبت نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ لیکن عملاً اس کی حیثیت سلبی رہی۔ اور اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اور وہ نکل بھی

کیسے سکتی تھی۔ جب کہ اس کے لئے نہ آئین سازوں نے کبھی سوچنے کی کوشش کی نہ انھوں نے سوچنے والوں کو ایسا موقعہ دیا تھا۔ بہرحال اس سے اتنا ہو گیا کہ ملاّ کی یقینی کلی اقتدار کی شکل باقی نہ رہی۔ لیکن اس دوسرے دور میں آئین کا جو خاکہ سامنے آیا وہ بھی کم افسوسناک نہ تھا۔ اس میں آئین کو اسلامی بنانے کے لئے یہ شق داخل کی گئی کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو "قرآن و سنت" کے منافی ہوگا۔ یہ شق آئین سازوں کی بے فکری کی دلیل تھی۔ اس سے بھی ملاّ کے داخلہ کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ کیونکہ جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آئے گا کہ کوئی قانون "کتاب و سنت" کے مطابق ہے یا نہیں تو اس کے متعلق حتمی رائے ملاّ ہی دے سکے گا۔ گویا اگر پہلی رپورٹ میں ملاّ کو باقاعدہ مسند پر بٹھا دیا گیا تھا تو اس میں اسے ساتھ والے کمرے میں بھیج کر دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ جب چاہے اس پر متمکن ہو جائے۔

ارباب اقتدار نے جدید فکری عوامل کے تعاون سے جو ہاتھ کھینچا تو ملاّ کے لئے میدان خالی ہو گیا۔ اس سے خود ارباب اقتدار کے لئے عجیب کشمکش پیدا ہو گئی۔ وہ ملاّ کے پیش کردہ تصور کو ناقابل عمل سمجھتے تھے لیکن اپنے آپ میں اتنی جرأت نہیں پاتے تھے کہ اسے مسترد کر دیں۔ ان کی اس گومگو نے ملک کے نوجوان طبقہ کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کا ماڈرن ذہن ملائیت کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن ملائیت ہی کو اسلام سمجھ کر وہ اسلام سے منحرف ہونے لگے ہیں۔ چونکہ مذہب کا اثر بہت گہرا ہے اس لئے ہمارے نوجوان علانیہ "نامسلمان" نہیں ہوئے لیکن نوجوانوں کے عام طبقہ کو ٹٹول کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہو رہے ہیں اور وہ گرمجوشی جو اسلامی نظام کے قیام کے لئے پائی جاتی تھی اب مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ گویا نہ محض نظام اسلامی کا واضح نقشہ مرتب نہیں کیا جا سکا بلکہ اس کے برعکس اس کے نفاذ کے خلاف بھی فضا پیدا ہونا شروع ہو گئی ہے۔ یہ ہے آئیڈیالوجی کی بنا پر مملکت کا قیام کرنے والوں کی آٹھ سال کی بہار گذاری!

کہا جا سکتا ہے کہ آئیڈیالوجی کے نفاذ میں ناکامی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ حسین انقلاب اندر شعور کا متقاضی ہے وہ ہنوز پیدا نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ رونا تنہا آئیڈیالوجی کا نہیں۔ حیات قومی کے کسی شعبہ میں بھی کسی ابھار اور عروج کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ غالب کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے ہاتھ میں وہ جام نہیں جس کے بادہ جاں فزا سے سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں۔ پاکستان مسلم لیگ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے یہ جماعت مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ ایک حد تک مسلم اور غیر مسلم کے مابین امتیاز کی ایک دلیل بن گئی تھی لیکن جب اس جماعت نے مملکت پاکستان کی عنان اقتدار سنبھالی تو سیاست میں دیکھتے دیکھتے وہ فساد رونما ہونا شروع ہو گیا کہ الامان والحفیظ۔ سیاست کا نقطۂ نگاہ شخصی تفوق بن گیا جسے دیکھئے وہ دیوانہ وار اپنے لئے سمیٹ رہا ہے کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ اس طرح مسلم لیگ مردہ ہو گئی اور سیاسی زندگی کا یہ حال ہو گیا کہ کوئی اور پارٹی اس کے مقابلہ میں ابھر نہیں سکی۔ آج بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں کسی پارٹی کا وجود نہیں اور سیاست کا محور پارٹیاں نہیں بلکہ افراد ہیں۔ اس ہمہ گیر افراتفری میں کاروبار حکومت اور نظم معاشرت کا جو حشر ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رہے سہے "پاکستان" کا سرفروشانہ نعرہ لگانے والوں میں سے اکثر نے چند ہی سالوں میں یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان بنا کر انھوں نے غلطی کی ہے۔ تاریخ میں شاید ایسی مثال ڈھونڈے سے بھی نہ ملے کہ کوئی تحریک علی رغم الفتح کامیاب ہو اور کامیاب ہو کر اپنی کامیابی پر کف افسوس ملے یا کسی قوم کو آزادی ملے اور آزاد ہونے کے بعد وہ متاسف ہو کہ وہ آزاد کیوں ہو گئی۔

آزادی نے مسلمانوں کے سامنے ترقی اور تعمیر کی نئی راہیں کھول دی تھیں لیکن ان پر گامزن ہونے کے لئے جس ملی شعور اور اجتماعی عزم کی ضرورت تھی وہ مفقود تھے۔ چنانچہ کسی منصوبے کے تحت متوازن ترقی کا سوال پیدا نہ ہو سکا۔ منصوبے بنتے ضرور ہے لیکن بے تدبیری اور فقدانِ عمل سے وہ مسلوں کی قبروں میں دفن ہو جاتے رہے۔ محض حالات کے دباؤ سے بعض شعبوں میں بے شک ترقی ہوئی اور محیر العقول۔ صرف صنعتی ترقی کے شعبے کو دیکھا جائے تو یہ باور کرنا مشکل ہوگا کہ اتنی حیرت انگیز ترقی ہو چکی ہے لیکن اس کا جذبہ محرکہ محض نفع اندوزی اور مفاد پرستی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترقی عجیب بے ہنگم طریق سے ہوئی ہے۔ یہ نہیں سوچا گیا کہ ملک کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ سوچا صرف یہ گیا کہ کس چیز میں زیادہ فائدہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج جب کہ پاکستان کئی مصنوعات میں خود کفیل بن چکا ہے اس کی معاشی ابتری میں کمی کے آثار نظر نہیں آتے۔ عوام کی قوتِ خرید بڑھانے کی کوئی خاطر خواہ شکل پیدا نہیں ہو سکی اور جسے قومی آمدنی کہا جاتا ہے وہ صرف چند ہاتھوں میں محدود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ "ملک کی مجموعی آمدنی" بڑھ رہی ہے لیکن قوم غریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس بے ربط صنعتی ترقی نے ملک کے لئے ایک اور خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ نو دولت مند صنعت کار اپنی دولت کے زور پر سیاست اور حکومت پر چھا جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا ملک پہلے جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا تو اب سرمایہ داروں کے قبضے میں آ رہا ہے۔ یہ "انقلاب" عوام کے حکمرانوں کو ضرور بدل رہا ہے لیکن ان کی معاشی مشکلات میں کمی یا استواری کا سبب نہیں بن رہا۔ دیکھا جائے تو یہ نتیجہ بالکل قابلِ فہم تھا۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

تقسیمِ ہند سے پہلے عشرہ کی سیاستِ ملی اور آزادی کے آٹھ سالوں کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ضمیر میں کسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ تحریکِ پاکستان نے مسلمانوں کے سطحِ شعور پر ہلکا سا ارتعاش ضرور پیدا کر دیا تھا۔ اور اس سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اس سے وہ "موجِ تند جولاں" بیدار ہو گی کہ

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

لیکن اس سطحی ارتعاش کو قلبی تموج اور ہیجان میں بدلنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ آئیڈیالوجی کے مطابق مملکت بنانے اور چلانے کے دعویداروں پر اولین فریضہ یہ عائد ہوتا تھا کہ وہ تعلیم پر ایسی توجہ صرف کرتے کہ اس سے مقاصد کا شعور پیدا ہوتا اور قوم میں اس شعور کے ساتھ متعین منزل کی جانب رواں دواں چلنے کے سامان پیدا ہوتے لیکن تعلیم سے مجرمانہ غفلت برتی گئی کہنے کو اسکولوں میں اضافہ ہوا نئے کالج کھلے یونیورسٹیاں قائم ہوئیں لیکن تعلیمی نظام کو آئیڈیالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جب خود قائدین میں آئیڈیالوجی کا شعور مفقود تھا تو وہ تعلیمی نصب العین کو کیسے صحیح سمت میں رکھ سکتے تھے۔ اس بے مقصدی اور بدنظمی کے نتائج رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آ رہے ہیں گو درسگاہوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور بڑھ رہی ہے لیکن تعلیم کے قابل بچوں کی بڑی تعداد تنگی جا کی وجہ سے ان میں داخل ہونے سے قاصر رہ جاتی ہے جو بچے اسکولوں میں نہیں جا سکتے وہ گھر اور معاشرت دونوں کے لئے طرح طرح کی پریشانیوں کا باعث بنتے جا رہے ہیں جو بچے داخل

ہو جاتے ہیں ان کی حالت بھی کم پریشان کن نہیں۔ ان کے لئے تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں اور تعلیمی معیار دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے سالانہ نتائج کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نتائج کا تناسب تدریجی طور پر کم ہوتا جا رہا ہے۔ گویا آئیڈیالوجی کا شعور پیدا کرنا تو ایک طرف محض خواندگی کا تناسب بڑھانے کے لئے بھی قابل ذکر سرگرمی نہیں دکھائی جا رہی۔"

---x---

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ ہمارے دور آزادی کے پہلے آٹھ سالوں پر تبصرہ تھا۔ آپ دیکھئے کہ اس دو سال میں (یعنی ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک) ہمارے حالات میں کوئی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جس کی بنا پر ان تاثرات میں کسی قسم کے ردوبدل کی ضرورت محسوس ہو، بجز اس کے کہ جن خرابیوں کی طرف ان میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی شدت اور بڑھ گئی ہے۔ اس دوران میں البتہ ہمارا دستور ضرور مرتب ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دستور نے ہمارے حالات میں کون سی اصلاح کر دی؟ اول تو اس دستور میں وہ شق ہی کون سی ہے جو ہماری مرفہ الحالی اور سربلندی کی ضامن بن سکے۔ اس دستور کا اسلامی ہونا تو بہت دور کی بات ہے وہ ان ممالک کے دساتیر جیسا بھی نہیں جن کا مطمح نگاہ رفاہیت بخش مملکت (welfare state) ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر دستور میں ایسی شقیں موجود بھی ہوں تو بھی وہ از خود ایسے نتائج تو مرتب نہیں کر دیا کرتیں جن کے لئے انہیں دستور میں رکھا جاتا ہے۔ دستور کوئی تعویذ نہیں ہوتا کہ اسے لکھ کر ایوان حکومت میں رکھ لینے سے برکاتِ ارضی و سماوی کے خزانے کھل جائیں وہ تو چند اصولوں کا مجموعہ ہوتا ہے جن کے مطابق عمل کرنے سے اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ سو جب کسی دستور پر عمل ہی نہ ہو تو اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حالات بڑے مایوس کن ہیں، لیکن ہمارے خیال میں اس پر بھی نا امید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ بہ حیثیت مسلمان ہماری اجتماعی زندگی کے بنیادی عناصر میں دو ہی چیزوں کی ضرورت تھی (اور ہے) ایک ہماری آئیڈیالوجی اور دوسرے وہ خطۂ زمین جس میں اس آئیڈیالوجی کی عملی تشکیل کی جا سکے۔ ہماری آئیڈیالوجی کا ضابطہ (قرآن) شروع سے محفوظ چلا آ رہا ہے اور محفوظ رہے گا باقی رہا خطۂ زمین سو اللہ کا شکر ہے کہ وہ بھی ابھی تک محفوظ ہے، اگرچہ مختلف تخریبی قوتوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی ہے (اور اب تک ہے) کہ زاغ البیت سے معذرت کے ساتھ

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

سو جب قرآن اور یہ خطۂ زمین ہمارے پاس محفوظ ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ آج ۱۴ اگست ۱۹۵۷ء نہیں بلکہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء ہے۔ لہٰذا اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ صحیح خطوط پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نئے سرے سے آغاز کر دیجئے۔

وقت آنست کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

---x---

مملکت سے نیچے آ کر جہاں تک حکومتی نظم و نسق کا تعلق ہے، تجربہ نے ایک ایسی تدبیر کی طرف راہ نمائی کی ہے کہ اگر اسے آزمایا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ اس سے عمدہ نتائج مرتب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ (جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں) ہمارے ارباب اقتدار کا نوے فیصدی وقت اور توانائیاں اس کوشش کی نذر ہو جاتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی پارٹی اکثریت میں رہے تاکہ وہ اپنی کرسی پر متمکن رہیں۔ اپنی ہستی (Existence) کی طرف سے عدم اطمینان اور غیر یقینی انسان کو کسی اور طرف دھیان دینے کے قابل ہی نہیں چھوڑتی۔ یہ آئینی اصول کہ جب تک کوئی پارٹی اکثریت میں رہے اس کی کابینہ برسر اقتدار رہے۔ ایک آزمودہ کار اور تربیت یافتہ قوم میں کامیاب ہے تو رہے لیکن ایک نو آموز اور "تازہ وارد بساط ہوائے دل" قوم میں یہ طریق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں حزب اختلاف کی ساری کوشش برسر اقتدار پارٹی کے استیصال میں اور متمکن پارٹی کی ساری قوت اپنے استقرار و تمکن میں صرف ہو جاتی ہے۔ ملک کی بہبود و ترقی کا نہ اُسے خیال ہوتا ہے نہ اسے فرصت۔ ہمارا خیال ہے کہ بحالات موجودہ ہمیں اپنے دستور میں تبدیلی کر کے ایسی شکل پیدا کر لینی چاہیئے جس کی رُو سے

(۱) دونوں صوبوں اور مرکز کے وزرائے اعظم کا انتخاب براہ راست ہو۔

(۲) صدر مملکت کی طرح ان کا تقرر ایک انتخاب سے دوسرے انتخاب تک کے عرصے کے لئے ہو۔

(۳) یہ وزرائے اعظم اپنی کابینہ آپ نامزد کریں۔ وزراء کا تقرر اور برطرفی وزیر اعظم کی مرضی پر موقوف ہو۔ لیکن وزیر اعظم یونہی برطرف نہ کیا جائے۔ اس کی برطرفی کے لئے وہی قاعدہ مقرر کیا جائے جو صدر مملکت کی برطرفی کے لئے آئین میں موجود ہے۔

اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ وزیر اعظم

اب چھری صیاد نے لی۔ اب قفس کا در کھلا

جیسی عدم یقین کی نفسیاتی کشمکش کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنا پورا وقت اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں صرف کرنے کے قابل ہو سکیں گے اور وزراء کے لئے بھی پارٹی کے ایک ایک ممبر کے آستاں پر جبہ سائی کے بجائے صرف ایک (وزیر اعظم) کی رضا جوئی مقصود ہو گی۔

اس سے جہاں ایک مستحکم حکومت کے نفع بخش نتائج سے متمتع ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پارٹیوں کی لعنت سے بھی رستگاری حاصل کر لیں۔ و ذٰلک ھو الفوز العظیم۔

جوئے نور

کاروان نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔　　بڑا سائز ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾

خدا نے زمین کو مخلوق کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔

یہ زمین کس کی ہے؟

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

(اقبال)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ زمیں کس کی ہے؟

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

ہمارے ایک اچھے سمجھدار دوست اگلے دنوں کہہ رہے تھے کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ جب ان سے اس بات کی تفصیل پوچھی گئی تو انھوں نے کہا کہ پاکستان کے بجٹ میں درج شدہ اعداد و شمار کی رو سے ۱۹۴۸-۴۹ء میں ملک کی کل آمدنی قریب چھیاسٹھ کروڑ تھی اور ۱۹۵۷-۵۸ء میں میزان آمدنی قریب ایک ارب انتالیس کروڑ ہے۔ یعنی اس دس سال میں ملک کی آمدنی دگنے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ یہ کیا کم ترقی ہے؟

ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جس آمدنی کو وہ "ملک کی آمدنی" سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت "حکومت کی آمدنی" ہے اور ملکوں کی ترقی یا تنزل کا اندازہ "ملک کی آمدنی" سے لگایا جاتا ہے نہ کہ حکومت کی آمدنی سے۔ اگرچہ وہ اس وقت تو خاموش سے ہو گئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھ نہیں سکے کہ ملک کی آمدنی اور حکومت کی آمدنی میں فرق کیا ہوتا ہے؟ یہی احساس ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا خیال ہے کہ (ہمارے اس دوست کی طرح) بہت سے احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ چونکہ ہر سال بجٹ میں ہماری آمدنی کی میزان میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے اس لئے ہمارا ملک اقتصادی طور پر کافی ترقی کئے جا رہا ہے۔ اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اصل حقیقت سے واقف ہوا جائے۔

ہمارے سالِ رواں کے بجٹ میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ کی آمدنی دکھائی گئی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ موٹی موٹی ملت Principal Heads) کیا ہیں جن پر یہ آمدنی مشتمل ہے۔

کسٹم (بحری چونگی)	قریب چوالیس کروڑ
اکسائز ڈیوٹی (چونگی آب کاری)	قریب چودہ کروڑ

انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس	قریب اکیس کروڑ
سیلز ٹیکس	قریب چودہ کروڑ
نمک اور متفرق ٹیکس	قریب چار کروڑ
نئی تجاویز کے مطابق ٹیکس۔	قریب آٹھ کروڑ

یعنی ایک ارب پانچ کروڑ کے قریب یہی ہو گئے۔ باقی کچھ ریلوے کی اور کچھ ڈاک خانہ وغیرہ کی آمدنی ہے۔ اُن چھوٹی چھوٹی مدات سے قطع نظر، ان بڑی بڑی مدات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں ملک کی آمدنی کس قدر ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک تاجر ولایت سے کوئی چیز منگاتا ہے جس کی قیمت (بندرگاہ پر پہنچکر) سو روپے بیٹھتی ہے۔ اس پر حکومت پچاس روپے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے۔ لہٰذا ساحل پر پہنچکر اس کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہو گئی۔ اس ڈیڑھ سو روپے پر (یوں سمجھئے کہ) بیس روپے سیلز ٹیکس ہے۔ یہ ہوئے ایک سو ستر تیس روپے دوکاندار کا منافع سمجھ لیجئے۔ لہٰذا خریدار کو اس کے دو سو روپے دینے پڑے۔ دوکاندار کے اس منافع سے حکومت نے کس روپے انکم ٹیکس وصول کیا۔

آپ نے غور کیا کہ اس لین دین میں ہوا کیا؟ حکومت نے قریب اسّی روپے ملک کے اندر بسنے والے (اپنے) لوگوں سے وصول کئے۔ یہی وہ رقوم ہیں جن کی میزان کو بجٹ میں پاکستان کی آمدنی دکھایا گیا ہے۔ آمدنی کے معنی ہیں (In-come) یعنی "اندر آنیوالی چیز"

دولت کی گردش

آپ سوچئے کہ ان تمام رقوم میں کوئی رقم بھی ایسی ہے جو کہیں باہر سے ملک کے اندر آئی ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ تمام رقوم ایسی ہیں جو ملک کے اندر ہی گردش کرتی رہی ہیں۔ ملک میں ایک ادارہ ہے جسے حکومت (گورنمنٹ) کہتے ہیں۔ اس کے ذمے ملک کا نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ اس نظم و نسق کے لئے اُسے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومت یہ روپیہ مختلف مدات میں ملک کے لوگوں سے وصول کرتی ہے۔ اور پھر ملک میں خرچ کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ روپے کی گردش Circulation of money ہے۔ ملک کی آمدنی یا (In-come) نہیں ہے اسلئے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے کی آمدنی تھی۔ اور ۱۹۵۷-۵۸ء کے بجٹ میں یہ آمدنی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ تو اس کے بجائے کہنا یہ چاہیئے کہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں حکومت اور لوگوں کے درمیان قریب چھیاسٹھ کروڑ روپے نے گردش کی اور ۱۹۵۷-۵۸ء میں قریب ایک ارب انتالیس کروڑ روپے کے گردش کرنے کی توقع ہے۔ ملک کا جو روپیہ ملک کے اندر گردش کرتا ہے اسے ملک کی آمدنی کہنا حدیثِ بے خبراں ہے۔ اور اس گردش (Circulation) کی زیادتی کو اقتصادی ترقی سمجھنا خوش فہمی!

اپنا ہی خون

اپنے روپے کو آمدنی سمجھنے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا ایک کتا ایک سخت سی ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی نے اس کی زبان اور ہونٹ زخمی کر دیئے جن سے خون نکلنے لگ گیا۔ وہ کتا اس خون کو مزے لے کر چاٹتا تھا اور جی میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ (خون) ہڈی سے نکل رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود اپنا ہی خون تھا۔ کہیں باہر سے نہیں آ رہا تھا۔

جو روپیہ ہمارے ملک میں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں چلا جائے اسے ملک کی آمدنی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ملک کی آمدنی وہ ہے جو

کہیں باہر سے آئے۔ جس طرح خوراک اسی کو کہتے ہیں جو باہر سے جسم کے اندر آئے۔ جسم کے خون کا جسم کے اندر گردش کرنا، خوراک (یا غذا) نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی یہ غذا کا کام دے سکتا ہے جس پر جسم کی پرورش کا دارومدار ہے۔ حکومت کی آمدنی جسم کے اندر خون کی گردش کا نام ہے۔ غذا کا نام نہیں۔ حکومت چونکہ ایک بہت بڑا ادارہ ہے اس لئے اس کا نظم ونسق اور آمدنی کا سلسلہ ذہن میں نہیں آتا۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ اپنے قصبہ کی

میونسپل کمیٹی کی مثال

میونسپلٹی کو سامنے لائیے۔ یہ میونسپلٹی چونگی وصول کرتی ہے۔ کن سے؟ شہر کے لوگوں سے۔ یہ اس میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہے۔ اس آمدنی سے وہ شہر کی سڑکوں، نالیوں وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔

اب آپ سوچئے کہ چونگی کی آمدنی، میونسپل کمیٹی کی آمدنی ہوتی ہے یا آپ کے شہر کی آمدنی۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ وہ کمیٹی کی آمدنی ہے۔ شہر کی آمدنی نہیں۔ اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ کسٹم، سیلز ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ سب حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں۔ ملک کی آمدنی کی نہیں۔

یہاں سے لازماً یہ سوال سامنے آئے گا کہ یہ حکومت کی آمدنی کی مدات ہیں تو ملک کی آمدنی کونسی ہوگی؟ ملک کی آمدنی وہ ہوگی جو ملک کے اندر کہیں باہر سے آئے۔

ملک کی آمدنی

باہر سے کیسے آئے؟ اس طرح کہ (مثلاً) جاپان کو گندم کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس فاضل گندم ہو۔ ہم یہ گندم جاپان کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اس گندم کی قیمت فروخت، ہمارے ملک کی آمدنی ہوگی۔ اس لئے کہ یہ رقم باہر سے آئی ہے۔

لیکن ہم گندم کو باہر اسی صورت میں بھیج سکیں گے جب یہ ہماری اپنی ضرورت سے زائد ہو۔ اگر ہمارے ہاں گیہوں اتنا ہی پیدا ہو جتنے کی خود ہمارے ملک کو خود ضرورت ہو، تو ہم باہر کیا بھیجیں گے؟ لہٰذا ہمارے ہاں گیہوں اتنا پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے ملک کی ضروریات پورا کرنے کے بعد، دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں جس سے ہمارے ملک کو آمدنی ہوسکے۔ آپ پوچھیں گے کہ ہمارے ملک کو اس آمدنی کی ضرورت کیا ہے؟ اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ جس طرح جاپان کو ہمارے ہاں سے گیہوں خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے، ہمیں بھی دوسرے ملکوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا پڑتا ہے (مثلاً دوائیاں، مشینری وغیرہ) یہ چیزیں اسی آمدنی سے خریدی جاسکتی ہیں۔

زمین کی پیداوار

لہٰذا بات سمٹ کر یہاں آگئی کہ کسی ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو اس ملک کی زمین سے پیدا ہو۔ اگر وہ پیداوار اتنی ہے کہ جس سے خود اس ملک کی اپنی ضروریات بھی پوری نہیں ہوسکتیں۔ تو اس ملک کو روٹی بھی دوسروں سے خریدنی یا مانگنی پڑے گی۔ اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اس ملک کی اپنی ضروریات ہی پورا کرسکتی ہے تو اسے دوسری چیزیں باہر سے نہیں مل سکیں گی۔ لیکن اگر یہ پیداوار اتنی ہے کہ وہ اپنی ضروریات پورا کرلینے کے بعد اسے باہر بھی بھیج سکتا ہے (خواہ خام شکل میں یا مصنوعات کی صورت میں) تو اس ملک کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہیگی۔ اس ملک کو فی الحقیقت خوش حال ملک کہہ سکیں گے۔

لہٰذا کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

زمین

میں ہے۔ خوش بخت ہے وہ ملک جس کے پاس زمین کافی ہو۔ جن ملکوں کے پاس زمین نہیں انھیں زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ بعض مغربی ممالک سے لگایئے۔ مثلاً انگلستان کو لیجئے۔ اسے اپنی خوراک کا بیشتر حصہ باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے

جن کے پاس زمین نہیں

اس نے پہلے تو یہ کیا کہ دور دراز ملکوں میں اپنی نو آبادیات Colonies قائم کیں۔ ان آبادیوں سے اس نے خام پیداوار حاصل کی۔ پھر اس سے ایسی چیزیں تیار کرنا شروع کیں جن کی دوسرے ممالک کو ضرورت تھی۔ پھر ایسی منڈیاں تلاش کیں جن میں ان مصنوعات کی کھپت ہو۔ لیکن یورپ میں اور ایسے ممالک بھی تھے جنہیں اپنی مصنوعات کے لئے انہیں منڈیوں کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ جب منڈیاں تھوڑی ہوں اور مال بیچنے والے زیادہ، تو ان میں باہمی کشمکش ہوگی۔ یہی وہ کشمکش ہے جو دنیا میں اس قدر خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا موجب بن رہی ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ جن ملکوں کو اس وقت ان مصنوعات کی ضرورت ہے اگر وہ انہیں خود اپنے ہاں تیار کرنے لگ جائیں تو پھر ان ممالک کا حشر کیا ہو جن کی زندگی کا دارومدار ان مصنوعات کی فروخت پر ہے؟ اس سے آپ نے پھر دیکھ لیا کہ کسی ملک کی زندگی اور خوشحالی کا راز

ارض یعنی زمین

میں ہے۔ بالفاظ دیگر ملک کی حقیقی آمدنی وہ ہے جو زمین سے باہر آئے۔ اسی پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے۔ جس ملک کی زمین کافی غلہ پیدا کر سکتی ہے وہ ملک کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ارضؔ کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

ارض کی اہمیت

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (۱۵/۲۰) ہم نے تمہارے لئے سامانِ زندگی ارض میں رکھا ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جنہیں تم رزق بہم نہیں پہنچاتے۔

جب انسان ابتدائی وحشی زندگی کے بعد تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوا۔ تو اس سے کہا گیا تھا کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) تمہارے لئے ارض میں مستقر ہے اور ایک وقتِ معین تک سامانِ زیست۔ تمہارے لئے بھی اور تمہارے مویشیوں کے لئے بھی۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۷۹/۳۳)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ زمین میں سامانِ زیست کے اس قدر خزانے مدفون ہیں کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ از خود باہر نہیں نکلتے۔ وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں یعنی طبعی قوانین کے مطابق باہر آتے ہیں۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (۱۵/۲۱) دوسری جگہ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ (۴۲/۲۷) کہا ہے۔ یعنی اس کے لئے خدا نے قانون مقرر کر رکھا ہے۔ اور وہ قانون ایسا نہیں جس کا کسی کو علم نہ ہو۔ زندہ قوموں میں زراعت کے متعلق نت نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ مٹی (soil) میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے اور اس میں پیداوار کی صلاحیت اور توانائی بڑھانے کے لئے نئے نئے آلات اور ادویات تیار کی جاتی ہیں۔ فصلوں کو کیڑوں اور موسموں کی شدت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے نہایت مؤثر تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ آب پاشی کے عجیب و غریب ذرائع دریافت کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب مصنوعی بادل بھی بن رہے ہیں۔ یہ

قوانینِ فطرت

تمام کوششیں ان قوانینِ فطرت (بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ یا بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ) کے مطابق انجام پاتی ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے متعین کئے گئے ہیں کہ زمین کے خزانوں کو باہر کیسے نکالا جائے۔ جو قومیں فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کوشش کرتی ہیں وہ خدا کی رحمتوں سے نوازی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتیں، خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جاتی

ہیں یہی وجہ ہے کہ خدا نے پیداوار کی کمی کو عذاب کہا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ..... (۷/۱۳۰) ہم نے فرعون کی قوم پر قحط سالی اور پیداوار کی کمی کا عذاب مسلط کر دیا۔ دوسری جگہ خود بھوک کو خدا کا عذاب کہا گیا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا۔ اللہ تمہیں ایک مثال کے ذریعہ بات

بھوک خدا کا عذاب ہے

سمجھانا چاہتا ہے۔ قَرْیَةً ایک بستی تھی۔ کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ اس کے بسنے والے نہایت امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے ان کے لئے سامان زیست (رزق) ہر طرف سے باِفراط چلا آتا تھا۔ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ۔ انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی۔ اُس کے قوانین کی اتباع سے انکار کر دیا۔ زمین سے جس طرح باِفراط رزق حاصل کیا جانا چاہیئے تھا، ان طریقوں کو چھوڑ دیا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ تو اللہ کے قانون کے مطابق ان پر بھوک کا عذاب مسلط ہو گیا اس طرح جب وہ روٹی کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے تو جن سے روٹی ملنے کی توقع تھی، ان کا خوف بھی ان کے دل میں پیدا ہو گیا۔ وہ ان سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے۔ ان سے خائف رہتے تھے کہ کہیں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ خدا نے ان کی حالت ایسی کیوں کر دی؟ اس کے متعلق کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نے یونہی خواہ مخواہ ان کی حالت ایسی کر دی۔ قطعاً نہیں۔ خدا کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی اپنی کرتوتوں کا نتیجہ تھا۔ یہ مصیبتیں ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھیں بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲)

قرآن کی ان تصریحات کو سامنے رکھیے اور پھر اپنے ملک کی حالت پر غور کیجئے۔ ہمارا ملک (سابق پنجاب اور سندھ کی وادی) ساری دنیا میں "اناج کی کوٹھی" (Gra nary) کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں اتنا غلہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کے بسنے والے خود بھی باِفراط کھاتے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ اب اسی ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ پچھلے دنوں نشتر ہال میں تقریر کرتے ہوئے امریکی نمائندہ مسٹر جان۔ او۔ بل۔ نے بتایا کہ ہم نے گذشتہ ڈیڑھ سال میں اسی کروڑ روپے کا غلہ

ہماری زرعی پیداوار کی حالت

باہر سے منگایا ہے۔ آپ نے غور کیا؟ اسی کروڑ روپے کا غلہ! ہمارے بجٹ میں سارے سال کی آمدنی ایک ارب انتالیس کروڑ دکھائی گئی ہے۔ ایک طرف اسے رکھئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ ہم نے ڈیڑھ سال میں اسی کروڑ روپے کا اناج دوسرے ملکوں سے منگایا ہے۔

یہ تو تھی گذشتہ ڈیڑھ سال کی بات۔ ہماری اسمبلی کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۵۷ء میں وزیر خوراک مسٹر دلدار احمد نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ اندازہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں امسال قریب چار لاکھ ساٹھ ہزار ٹن غلہ کی کمی ہو گی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی کمی اس اندازہ سے بھی زیادہ ہے۔ آخری اطلاع یہ ہے کہ ہمیں اس سال قریب پینسٹھ (۶۵) کروڑ روپے کا غلہ باہر سے منگانا پڑے گا۔ یعنی ہمارے بجٹ میں سال بھر کی آمدنی کا تخمینہ ایک ارب انتالیس کروڑ ہے اور اس میں سے پینسٹھ کروڑ کا غلہ باہر سے منگانا پڑے گا۔ یا للعجب!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اگر دوسرے ملکوں سے کوئی چیز منگانی پڑے تو اس کی قیمت ہمارے روپے میں ادا نہیں کی جا سکتی اُن کے سکے میں ادا کرنی پڑتی ہے جن سے وہ چیز خریدی جائے۔ ان کا سکہ ہمیں اسی صورت میں مل سکتا ہے جب ہم اُن کے ہاتھوں کوئی

اپنی چیز فروخت کریں۔ ہمارے ہاں دوسروں کے ہاتھ بیچنے کے لئے زمین کی پیداوار ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً پٹ سن۔ روئی۔ چائے وغیرہ۔ لیکن ہم نے گزشتہ دس سال میں جس قدر زرعی پیداوار باہر بھیجی ہے اس سے قریب چار گنا زیادہ قیمت کا غلہ باہر سے منگایا ہے۔ آپ سوچئے کہ سوائے اس کے کہ ہم دوسری قوموں سے قرضہ مانگیں یا امداد طلب کریں ہمارے پاس، روٹی حاصل کرنے کی اور کونسی شکل ہے؟

سب اپنا پیدا کردہ ہے

اور یہ سن کر آپ کلیجہ مسوس کر رہ جائیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ کچھ کسی آسمانی آفت یا زمینی بلا کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہ سب (قرآن کے الفاظ میں) ہمارے اپنے ہاتھوں کا پیدا کردہ ہے۔ ہمارے ہاں زمین کی کمی نہیں لیکن ہماری نااہلی کی حالت یہ ہے کہ اول تو ہماری زمین کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس میں کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں قابلِ کاشت زمین قریب ۲۳,۳۴,۳۱,۶۸۰ ایکڑ ہے اس میں سے قریب ۵,۰۵,۵۹,۰۰۰ ایکڑ زمین میں غلہ کی کاشت ہوتی ہے۔ اور ۷۵,۸۹,۰۰۰ ایکڑ میں سبزیاں ترکاریاں بوئی جاتی ہیں۔ یعنی کل رقبہ زیرِ کاشت ۵,۸۱,۴۸,۰۰۰ ہے۔ بالفاظِ دیگر ہماری قابلِ کاشت زمین کا قریب ایک چوتھائی حصہ زیرِ کاشت ہے اور باقی تین چوتھائی زمین غیر آباد ہے۔ اس زیرِ کاشت رقبہ میں سے قریب دو لاکھ ایکڑ میں ہم تمباکو کی کاشت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دستاً کسی بھوکے کو ایک روپیہ مل جائے اور وہ اس روپیہ کا جا کر حقہ خرید لائے۔ ہم اپنے زیرِ کاشت رقبہ میں تمباکو کی کاشت کرتے ہیں اور روٹی دوسروں سے مانگ کر کھاتے ہیں۔ کیا ایسی قوم بھی دنیا میں کہیں اور دیکھی سنی گئی؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ ہمارا جس قدر رقبہ زیرِ کاشت ہے اس کا کافی حصہ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر جان۔ او۔ بل۔ کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں ہر سال قریب ایک لاکھ ایکڑ زمین بیکار ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی پاکستان میں بارانی رقبہ قریب چالیس فیصد ہے اس میں ہر سال قریب بارہ ہزار ایکڑ زمین ناقابلِ کاشت ہوتی جا رہی ہے۔

تیسری بات یہ کہ جس رقبہ میں کاشت ہوتی ہے۔ اس میں پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ مثلاً ۴۹-۱۹۴۸ء میں ہمارے ہاں چاول کی پیداوار قریباً گیارہ من فی ایکڑ تھی۔ اور گیہوں کی قریب ساڑھے دس من فی ایکڑ۔ لیکن ۵۶-۱۹۵۵ء میں چاول کی پیداوار کی اوسط قریب نو من رہ گئی اور گیہوں کی قریب آٹھ من فی ایکڑ۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں چاول کی مجموعی پیداوار قریب چوراسی لاکھ ٹن تھی لیکن ۵۶-۱۹۵۵ء میں یہ پیداوار قریب ستر لاکھ ٹن رہ گئی۔ اسی طرح گیہوں کی مجموعی پیداوار ۴۹-۱۹۴۸ء میں قریب چالیس لاکھ ٹن تھی جو ۵۶-۱۹۵۵ء میں قریب تینتیس لاکھ ٹن رہ گئی۔ حالانکہ زیرِ کاشت رقبہ دونوں صورتوں (چاول اور گیہوں) کے لئے ۴۹-۱۹۴۸ء کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔ ادھر زمین کی بیکاری اور پیداوار کی کمی کی یہ حالت ہے اور دوسری طرف ہماری آبادی قریب دس لاکھ نفوس سالانہ کی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

اس کے مقابلہ میں ذرا دوسرے ملکوں کی حالت پر غور کیجئے۔ پہلے اوسط پیداوار کو لیجئے۔

ممالک	چاول	نیشکر	گیہوں	
۱۔ پاکستان۔	۱۱ (من)	۳۸۳	۸½	(اوسط پیداوار فی ایکڑ)
۲۔ جاوا	۱۸	۱۳۳۶	×	
۳۔ جاپان	۴۷	×	۱۹	

۴- مصر	۴۳	۶۳۳	۱۹

یہ اس لئے کہ (علاوہ دیگر وجوہات) جاپان میں مصنوعی کھاد کا استعمال قریب ساٹھ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مغربی یورپ میں قریب تین سو پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے اور پاکستان میں صرف ایک پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے۔ حالانکہ اس کھاد کا استعمال بیس سے چالیس فیصدی پیداوار بڑھا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ

(۱) مغربی یورپ کے پاس ساری دنیا کے رقبۂ زمین کا قریب ۱/۳ (تین فیصدی) حصہ ہے اور پندرہ فیصدی آبادی لیکن یہ کل دنیا کی خوراک کا ایک تہائی حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) اس میں اگر روس اور شمالی امریکہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو دنیا کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ان ممالک میں بستا ہے اور دنیا کی خوراک کا ۴/۵ حصہ ان ممالک میں خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی ۱/۵ حصہ اور ساری دنیا کے لئے بچتا ہے۔ اس میں سے ایشیا کے حصہ میں صرف سترہ فیصدی آتا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر آپ سوچئے کہ ہم کہاں ہیں۔ کدھر جا رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اول تو یہی چیز قابلِ غور ہے کہ ہمیں ہر سال جس قدر غلہ کی ضرورت پڑتی ہے اور جسے خریدنے کے لئے ہمارے پاس زرِ مبادلہ نہیں ہوتا وہ ہمیں قرضہ یا امداد کے طور پر کب تک ملتا رہے گا؟ دوسرے یہ کہ ہمیں جو قرضہ یا امداد مل رہی ہے۔ اس کی ہمیں قیمت کس قدر ادا کرنی پڑ رہی ہے؟

اس کا علاج؟

اب سوال ہے کہ اس صورتِ حالات سے نکلنے کی شکل کیا ہے؟ اس کے متعلق کہا یہ جائے گا کہ ہمیں زمین کو بہتر بنانے اور اس کی پیداوار بڑھانے کے سوال پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔ جس قدر افتادہ زمین ہے اسے قابلِ کاشت بنانا چاہیئے۔ قابلِ کاشت زمین کو بیکار نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ نئے آلات اور ادویات سے مٹی Soil کو زیادہ سے زیادہ تندرست و توانا بنانا چاہیئے۔ وسائلِ آب پاشی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سب ٹھیک ہے اور ان تدابیر کا اختیار کرنا نہایت ضروری۔ لیکن یہ ضابطۂ خداوندی کا صرف ایک پہلو ہے جسے طبعی قوانین کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ قرآن کی رو سے وہ گوشہ بنیادی ہے۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ایک ایک زمیندار دس دس ہزار (بلکہ ایک ایک لاکھ) ایکڑ کا زمین کا مالک ہے۔ اسے اسکی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ اس کی زمین کی حالت کیا ہے۔ اس کی پیداوار گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔ وہاں سے جو کچھ بھی آ جائے اس کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ زمین کاشت کاروں کے پاس ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ اس کے مالک نہیں ہوتے محض مزدور ہوتے ہیں اس لئے یہ اسکے سنوارنے کی فکر نہیں کرتے اور اگر کرنا چاہیں بھی تو ان کے پاس اس کے وسائل ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے کاشت کاروں کی حالت جس قدر قابلِ رحم ہے اس کا اندازہ ہم شہری بمشکل لگا سکتے ہیں۔ ہم پرانے زمانے کے غلاموں کے حالات پڑھ پڑھ کر خون کے آنسو بہایا کرتے ہیں۔ اگر ہم کہیں ان کاشتکاروں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو معلوم ہم پر کیا گذر جائے؟ ان بیچاروں کو محض

کاشتکاروں کی حالت

شکل وصورت کے اعتبار سے انسان سمجھئے۔ ورنہ ان سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ حیوانات سے بدتر ہے۔ ہمارے ہاں لیبر (مزدوروں) کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا یا کہا جاتا ہے۔ لیکن مزدوروں میں یہ کاشتکار شامل نہیں کئے جاتے۔ ان سے صرف وہ مزدور مراد ہوتے ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی اسّی فیصدی آبادی کاشتکاروں پر مشتمل ہے (اور کل مزدوروں کا ۸۰ فیصدی حصہ کاشتکار ہیں) باقی بیس فیصدی میں سے دس فیصدی کارخانوں کے مزدوروں کو سمجھ لیجئے اور دس فیصدی زمیندار۔ تاجر۔ کارخانہ دار۔ ملازمت پیشہ وغیرہ۔ ہم دس فیصدی آبادی (کارخانوں کے مزدوروں) کے متعلق تو اتنا کچھ کہتے یا کرتے ہیں۔ لیکن اسّی فیصدی آبادی (کاشتکاروں) کے متعلق کبھی خیال تک بھی نہیں کرتے کہ یہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مزدوروں کے متعلق قانون موجود ہے کہ ان سے اتنے گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا اور (Living Wage) سے کم اجرت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی انھیں اتنی اجرت ضرور ملنی چاہیئے جس سے ان کا گذارہ ہو سکے۔ نیز مزدوروں کی صحت۔ آسائش۔ تفریح کے لئے بھی قوانین موجود ہیں۔ لیکن بیچارے کاشتکاروں کے متعلق کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ انھیں کتنے گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے اور سال کے بعد انھیں ملتا کیا ہے؟ نہ کسی کو ان کی صحت کا خیال ہے۔ نہ آسائش کا۔ نہ مکان کا نہ خوراک کا۔ وہ اپنے بیلوں اور گدھوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اور انھیں ان سے بھی کم کھانے کو ملتا ہے۔ آپ سوچئے! کہ جو کاشتکار ان حالات میں کام کریں وہ زمین کو سنوارنے کی فکر خاک کر سکیں گے؟

اب آپ پوچھیں گے کہ خدا کے اس قانون نے جسے اوپر بنیادی بتایا گیا ہے ان خرابیوں کا علاج کیا تجویز کیا ہے؟ اس نے بڑا سیدھا اور صاف علاج تجویز کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لئے سامانِ زندگی (رزق) حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس طرح فضا کی ہوا۔ سورج کی روشنی۔ ندی کا پانی ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ ان پر ذاتی قبضہ جما لے۔ اسی طرح زمین کے متعلق بھی خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہونی چاہیئے۔ سورۂ حم سجدہ میں ہے قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔ کیا تم اس خدا کے قانون سے انکار کرتے ہو جس نے اس زمین کو دو مراحل میں پیدا کیا (پہلا مرحلہ وہ تھا جب وہ اس قدر گرم تھی کہ اس میں کچھ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا اور دوسرا مرحلہ وہ جس میں یہ اس قابل ہو گئی کہ اس پر جاندار مخلوق رہنے لگی اور یہ ان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچانے لگی) کیا تم اس زمین کے معاملہ میں (جو خالصۃً خدا کی ملکیت ہے) اس کے ہمسر بناتے ہو؟ اس نے زمین کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیونکہ وہ رب العالمین (تمام انسانوں کا پرورش کرنے والا) ہے وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا۔ اس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے (جو اس کے سلسلۂ آب رسانی کا اہم ذریعہ ہیں) وَبَارَكَ فِيهَا اور اس میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ اور اس کی پیداوار (فصلوں) کے لئے چار موسم مقرر کئے۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰) یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔

زمین پر ذاتی ملکیت جائز نہیں

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ لوگوں کو زمین کا مالک قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم انھیں خدا کا ہمسر بنا رہے

ہو! اسی ضمن میں سورۂ بقرہ میں کہا ہے کہ خدا نے تمہارے پاؤں کے نیچے زمین پیدا کی۔ اوپر آسمانی گنبد بنائے۔ بادلوں سے پانی برسایا۔ اس سے فصلیں پیدا کیں تاکہ وہ تمہارے لئے وجہ زینت بن سکیں۔ اس کے بعد ہے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۲۲) لہٰذا تم خدا کے ہمسر نہ بناؤ۔ اگر تم ذرا بھی علم و عقل سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ اس کا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا۔ سورۂ عبس میں ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے رزق (خوراک) پر غور کرے اور سوچے کہ اس میں کونسی چیز ہے جو اسکی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ زمین میں پیداوار کی صلاحیت کا موجود ہونا۔ بادلوں سے پانی کا برسنا۔ اس سے بیج کا پھوٹ کر کونپل بننا۔ کونپل کا بڑا ہو کر پودا بننا۔ پودے میں پھل اور اناج پیدا ہو جانا یہ سب خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۷۹/۳۳) ہونا چاہیئے۔ یعنی تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زندگی۔ نہ یہ کہ لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر اس کے مالک بن بیٹھیں۔ خود عیش اڑائیں اور کاشتکار بیچارے بھوکوں مریں۔

سورۂ واقعہ میں اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارے قانون (نشوونما) کا حصہ کس قدر؟ تم ہل چلا کر زمین میں بیج ڈالتے ہو۔ اس کے بعد ہے ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔ کیا اس بیج کو فصل میں تم تبدیل کرتے ہو یا ہم تبدیل کرتے ہیں؟ اگر ہمارا قانون اس دانہ کو فصل میں تبدیل نہ کرے تو تمہاری ساری محنت اکارت چلی جائے اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ؟ اس کے بعد پانی کے متعلق یہی کچھ کہا ہے اور پھر آگ کے متعلق۔ اور ان سب کے بعد ہے کہ ہم نے یہ سارا سلسلہ اس لئے قائم کر رکھا ہے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ بن سکے (۵۶/۷۳-۷۴) یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ رزق بن سکے۔

یہ ہے خدا کا وہ قانون جسے اس نے اس سلسلہ میں بنیاد ہی قرار دیا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم یہ تو مانتے ہو کہ سورج خدا کا ہے۔ اس پر کسی کی ملکیت جائز نہیں۔ ہوا خدا کی ہے۔ یہ ہر ایک کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ چاند اور ستاروں کی روشنی خدا کی ہے۔ اس سے ہر ایک کو مستفید ہونا چاہیئے۔ لیکن جب تم زمین کی طرف آتے ہو تو اس کے متعلق کہتے ہو کہ نہیں! اس پر لوگوں کی ذاتی ملکیت ہونی چاہیئے تاکہ غریب اور کمزور بھوکے مریں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کا الٰہ (حاکم اور مالک) کوئی اور ہو اور زمین کا الٰہ کوئی اور۔ سورۂ انبیاء میں ہے اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ کیا انہوں نے ارض میں اور الٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن کے سہارے یہ پھیلنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲) اگر ان میں اللہ کے علاوہ اور الٰہ ہوتے تو ساری کائنات درہم برہم ہو جاتی۔ اس لئے هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) آسمانوں میں الٰہ بھی وہی ہے اور زمین میں الٰہ بھی وہی۔

دو خدا؟

اسلام اور کمیونزم

اس مقام پر بعض لوگ جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جسے کمیونسٹ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہو گئے۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے متعدد بار تفصیل سے لکھ چکے ہیں جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت

نہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اگر اتنی سی بات سے (کہ اسلام کی رُو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں اور کمیونزم میں بھی زمین کی ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے) اسلام اور کمیونزم کو ایک قرار دیا جائے تو پھر شاید دنیا میں کوئی نظریہ اور کوئی نظام بھی ایسا نہ رہے گا جسے اسلام جیسا نہ سمجھ لیا جائے۔ مثلاً

(۱) اسلام میں شراب کی ممانعت ہے۔ اور بھارت کا سیکولر نظام بھی شراب کی ممانعت کرتا ہے۔ اس لئے اسلام اور بھارت کا سیکولر نظام ایک ہی ہوا۔

(۲) اسلام بت پرستی کو شرک قرار دیتا ہے اور آریہ سماج بھی بت پرستی کی سخت مخالفت کرتا ہے اس لئے اسلام اور آریہ سماج ایک ہی ہوا۔

(۳) اسلام میں خنزیر حرام ہے اور یہودی بھی اسے نہیں کھاتے اس لئے اسلام اور یہودیت ایک ہی ہوئے۔

(۴) اسلام میں زنا کی ممانعت ہے اور عیسائیت بھی اسے حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اسلام اور عیسائیت ایک ہی ہیں۔

اسلامی فلسفۂ زندگی

غرضیکہ اس قسم کی مشابہت کی باتوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا کوئی نظریہ، عقیدہ یا حکم کسی اور مذہب اور نظام میں بھی پایا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو جاتے کہ اسلام اور وہ مذہب یا نظام ایک ہی ہیں۔ لہٰذا اگر اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں اور کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ تو ان دونوں میں اس ایک بات کے مشترک ہونے سے اسلام اور کمیونزم ایک نہیں ہو جاتے۔ اسلام صرف اسی ایک سوال کا نام نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اسلام ایک "فلسفۂ زندگی" ہے۔ وہ انسان کی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے اندر لیتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے خاص قوانین عطا کرتا ہے۔ یہ قوانین وحیٔ خداوندی کی رو سے عطا ہوئے ہیں اور ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ (i) انسانی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے تابع رہنا چاہیئے اور (ii) انسان کے ہر ایک عمل (بلکہ ارادہ اور خیال تک بھی) اپنا نتیجہ مرتب کرکے رہتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ۔ بُرے کام کا بُرا نتیجہ۔ یہ نتائج اس زندگی میں بھی انسان کے سامنے آتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ خدا نے جو قوانین عطا کئے ہیں ان میں ایک حصہ انسان کی معاشی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ ان قوانین کی رو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔

اشتراکی فلسفہ

اس کے برعکس کمیونزم بھی محض معاشی نظام کا نام نہیں۔ وہ ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ یہ فلسفۂ زندگی اسلام کے فلسفۂ زندگی کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ کمیونزم کے فلسفۂ زندگی کی بنیاد ان عقائد پر رکھی گئی ہے کہ (i) خدا کا وجود کوئی نہیں۔ یہ محض سرمایہ داروں کا رچایا ہوا ڈھونگ ہے (ii) انسان کی زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت کے بعد کوئی اور زندگی نہیں۔ (iii) جب خدا کا کوئی وجود نہیں تو وحی کا تصور بھی غلط ہے اور (iv) جب وحی کا تصور غلط ہے تو نبوت اور رسالت بھی کوئی شے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کمیونزم اور اسلام کس طرح ایک دوسرے سے متضاد ہیں! اس قدر متضاد کہ یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص کمیونزم

کے فلسفہ کو مانتا ہو کسی صورت میں بھی مسلمان نہیں کہلا سکتا. کوئی کمیونسٹ مسلمان نہیں ہو سکتا اور کوئی مسلمان کمیونسٹ نہیں بن سکتا. اگر کمیونزم کے معاشی نظام کی بعض شقیں قرآن سے ملتی جلتی ہیں، تو جو شخص قرآن کے معاشی نظام کو منزل من اللہ مانتا ہے وہ کمیونسٹ نہیں ہو جاتا۔ یہ

فریب دہی

غلط فہمی ہے جو سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے پھیلائی جاتی ہے. یعنی جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں تو یہ جھٹ سے پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کمیونسٹ ہے. مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کے مفاد پر زد نہ پڑے.

لیکن سرمایہ دار طبقہ جانتا ہے کہ ان کی اس چیخ و پکار سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا. اس لئے کہ اب ہر شخص اس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ لوگ محض اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر ایسا کہتے ہیں. اس مقصد کے لئے انہوں نے بعض (نام نہاد) مذہبی پیشواؤں کی تائید حاصل کر لی اور

ارباب شریعت

انہوں نے خدا اور رسول کا نام لے کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ شریعت کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت کی پوری پوری اجازت ہے اور اس پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی. چنانچہ ایک طرف جماعت احمدیہ کے امیر مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے "اسلام اور ملکیت زمین" کے عنوان سے قریب پونے تین سو صفحات کی کتاب شائع کر دی جس میں یہ ثابت کرنے کی (ناکام) کوشش کی کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت بالکل جائز اور درست ہے. دوسری طرف جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے قریب پچھتر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ شائع کر دیا جس میں لکھا کہ

> جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ. اتنے مکان. اتنا تجارتی کاروبار اتنا صنعتی کاروبار. اتنے مویشی. اتنی موٹریں. اتنی کشتیاں. اور اتنی فلاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو. اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو. پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم اتنی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جسے تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے کے ذریعے کرتے ہو. اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں۔
>
> (ص ۴۲)

یہ فتوے قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے اور صاحب مضمون نے اس کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کی (اگرچہ یہ ایک الگ موضوع ہے. لیکن یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ اسلام نے اس کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ تم جس قدر دولت جمع کرنا چاہتے ہو کرو. قرآن کی رو سے دولت کے انبار جمع کرنا قطعاً ناجائز ہیں جو حضرات اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظام ربوبیت" ملاحظہ فرمائیں) بہر حال یہ ہے ہمارے ان پیشوایان مذہب کا وہ مسلک جسے جاگیرداری اور زمینداری (زمین پر ذاتی

ملکیت) کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی تعلیم (گذشتہ صفحات میں) آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اس کے پیش نظر اس امر کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلام میں زمین پر ذاتی ملکیت جائز ہے یا نہیں۔

انسانیت کی لعنت

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کمزور انسانوں پر بالادست طبقے نے جو ظلم و ستم روا رکھے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک طاقتور انسان ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھا اور ہزاروں مظلوم اس کی خاطر اپنا لہو پسینہ ایک کر کے زمین میں کاشت کرتے رہے۔ قرآن نے آکر اس لعنت کو ختم کر دیا اور کہدیا کہ زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ سواء للسائلین۔

آج پاکستان جن مشکلات سے دوچار ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ملک کی زمین، بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت میں ہے اور غریب کاشتکار بھوکے مر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اس زمین سے اتنی پیداوار نہیں ہو رہی جتنی ہونی چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کریم کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیں اور اس باب میں اسکی تعلیم پر عمل کریں۔

کرنے کا کام

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہو گی کہ حکومت کے لئے (سردست) کرنے کا کام یہ ہے کہ:-

(۱) زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور ساری زمین مملکت کی تحویل میں دے دی جائے حکومت غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا ایک پلان بنائے اور اس پر فی الفور عمل درآمد شروع کر دے۔

(۲) ہر شخص کی تحویل میں (ملکیت میں نہیں بلکہ تحویل میں) اتنی زمین دی جائے جسے وہ خود کاشت کر سکے۔

(۳) حکومت اس زمین کے نقائص دور کرنے اور اسے توانا اور تندرست بنانے کے ضروری سامان اور اسباب مہیا کرے۔

(۴) حکومت خود فیصلہ کرے کہ کتنے رقبہ میں کس جنس کی کاشت ہو گی۔

(۵) اس رقبہ کی پیداوار میں سے کاشت کرنے والے کی ضرورت کے مطابق اس کے پاس رہنے دی جائے اور باقی جنس کو حکومت مناسب (معقول قیمت پر خرید لے۔ اس رقم کو اس کاشتکار کی آمدنی قرار دیا جائے۔ اور ملک کے عام انکم ٹیکس کے قاعدے کے مطابق اس آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے مالیہ وغیرہ کچھ وصول نہ کیا جائے۔

(۶) فصلوں کو آفات ارض و سماوی سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔ نیز کاشتکار کی بیماری یا اس کے مال مویشی کے نقصان کی صورت میں اس کی مناسب امداد کی ذمہ داری بھی۔

(۷) ملحقہ دیہات کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کر کے، میونسپل کمیٹی کے انداز سے اہل دیہات کی صحت، تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خدا کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (۹۶) اگر ان بستیوں والے خدا کے اس قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان دروازوں سے جو آمدنی آئے گی اُسے کہا جائے گا "ملک کی آمدنی" اور اسی پر ملک کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہوگا۔ فلاح گئے تو معنی ہی کھیتی کے ہیں!

اگر ہم نے یہ کچھ نہ کیا تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہے کہ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر کمیونزم کا طوفانِ بلا کہیں اِدھر کا رخ نہ کرلے اور اس کا کسے علم نہیں کہ

اِس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

نہ صرف یہ بلکہ دین اور انسانیت بھی!

اس سے بچنے کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم خدا کے ضابطۂ قانون کے دامن میں پناہ لیں اور زمین کو ذاتی ملکیت کے پنجوں سے نکال کر ملت کی مشترکہ تحویل میں دے دیں جو اسے ضرورت مندوں میں حسبِ ضرورت تقسیم کرتی رہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی ملک کو خدا کے حوالے کرنا۔

ملکِ یزداں را بہ یزداں بازدہ
تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

نظامِ ربوبیت

از:- پرویز

نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا حل کیا بتایا ہے۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب

بڑا سائز ضخامت ۱۰۰۰ صفحات۔ قیمت۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ

حسب ذیل پمفلٹس بھی دیکھیے

جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اہم اور ضروری سوالات کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔

علماء کون ہیں؟ عربی مدرسوں کے فارغ التحصیل نہیں بلکہ وہ حضرات ہیں جو ارض و سماوات میں خدا کی پھیلی ہوئی آیات پر غور و تفکر کرتے ہیں۔ اور ان سے صحیح نتائج تک پہنچتے ہیں۔ قیمت ۲ر

بادۂ زندگی محترم پرویز صاحب کا وہ بصیرت افروز خطبہ۔ جس سے موصوف نے طلوع اسلام کنونشن لاہور کو خطاب کیا۔ حسن و حقائق کا مرقع۔ قیمت ۲ر

تقدیرِ امم قوموں کی موت و حیات کے قرآنی اصول کیا ہیں۔ صلاحیت اور جد و جہد کی اہمیت۔ دولت کی صحیح تقسیم اور استخلاف فی الارض جیسے اہم مباحث۔ قیمت ۲ر

جنسیات قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دورِ حاضر کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی راہ نمائی کی ابدیت و صداقت کا اثبات۔ ایک نازک مسئلہ کا لطیف ترین تجزیہ۔ قیمت ۲ر

مقامِ محمدیؐ حضور سرورِ کائناتؐ انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھے اور معراجِ محمدیؐ سے کیا مقصود ہے؟ مقالہ نہیں بلکہ جناب پرویز کو حضور رسالتمآبؐ سے جو والہانہ عشق ہے اس کا بادہ لبریز ہے جو بے ساختہ چھلک پڑا ہے۔ قیمت ۲ر

قانونِ شریعت علامہ اقبال کی اہم ترین کتاب (لیکچرز کے چھٹے باب کا آزاد ترجمہ۔ جس میں علامہ مرحوم نے بتایا ہے کہ اسلامی قوانین جامد اور ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں۔ ان میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ردوبدل کیا جا سکتا ہے قیمت ۲ر

جشنِ نزولِ قرآن قرآن کریم کا تعارف خود قرآن سے جس سے آپ کو قرآن کریم کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکیگا۔ قیمت ۲ر

اردو زبان میں نماز بے سوچے سمجھے نماز پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے ہمیں قرآن کے اس حصہ کو سمجھنا چاہیئے جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ نماز میں قرآن کا ترجمہ نہیں پڑھا جا سکتا کیونکہ غیر قرآنی الفاظ کسی طرح بھی قرآنی الفاظ کا بدل نہیں بن سکتے۔ قیمت۔ ار

اندھے کی لکڑی تقلید اور اس کے مضر اثرات سے کس طرح بچا جا سکتا ہے قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ایچ ایس سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

مجلسِ اقبال

مثنوی رموزِ بیخودی

(پیشکش بحضور ملتِ اسلامیہ)

صحبتِ امروز سے علامہ اقبال کی مثنوی کا دوسرا حصہ (رموزِ بیخودی) ہمارے سامنے آتا ہے۔ حصۂ اول (اسرارِ خودی) میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا تھا کہ انسان صرف طبعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر (جسم کے علاوہ) ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات۔ یا نفس۔ یا خودی کہتے ہیں۔ اس (ذات۔ یا خودی) میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو یہ موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے اور اپنی مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی حیاتِ جاوید حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی یہ نشوونما صرف معاشرہ (سوسائٹی) کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے۔ تنہا (انفرادی طور پر) نہیں ہو سکتی۔ اس طرح ہمارے سامنے دو مستقل عناصر آتے ہیں یعنی فرد کی انفرادیت اور معاشرہ کی اجتماعیت۔ اگرچہ معاشرہ افراد ہی کے مجموعہ کا دوسرا نام ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود، فلسفۂ عمرانیت کی رو سے معاشرہ اپنا الگ وجود رکھتا ہے اور جداگانہ خصائص و مضمرات۔ لہٰذا سب سے بڑا سوال جو انسان کے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ (یا جماعت) کا باہمی تعلق کیا ہے؟ فرد معاشرہ کے لئے ہے یا معاشرہ فرد کے لئے؟ کیا معاشرہ کے استحکام اور بقا کے لئے افراد کو قربان کر دینا چاہیئے یا معاشرہ کا فریضہ افراد کا تحفظ سمجھنا چاہیئے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ انسان نے جب سے اپنی تمدنی زندگی (حیاتِ اجتماعیہ) کے متعلق سوچنا شروع کیا ہے، یہ اس کی توجہات کا مرکز بنے رہے ہیں۔ سب سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب ری پبلک (جمہوریت) میں اس سوال کو اٹھایا۔ جو کچھ اس نے کہا اس کا حاصل یہ ہے کہ وجودِ حقیقی معاشرہ کا ہے فرد کا نہیں۔ یہاں تک کہ کسی بچے کو بھی اس کے باپ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں معاشرے کی مشترک اولاد سمجھنا چاہیئے۔ اس تصور کو عملی شکل دینے کے لئے اس نے تجویز کیا تھا کہ اعلیٰ طبقہ میں کوئی عورت کسی خاص مرد کی بیوی بن کر نہ رہے بلکہ تمام عورتیں مشترکہ طور پر مردوں سے اختلاط رکھیں۔ یہ کمیونزم کی انتہائی شکل تھی۔ اس تصور کا اتنا حصہ کہ فرد اپنی حیثیت کچھ نہیں رکھتا، اس تصوف (Mysticism) میں جا کر پروان چڑھا جس کا بیج خود افلاطون نے بویا تھا۔ لیکن اس تصوف نے جہاں یہ کہا کہ فرد کی خودی سب سے بڑا شر (EVIL) ہے۔ جب تک اسے فنا نہ کیا جائے انسان اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی اجتماعی زندگی کو بھی قابلِ نفرت قرار دیدیا اور کہدیا کہ تزکیۂ نفس

(رافنائے ذات) معاشرہ سے الگ ہٹ کر تجرد کی خلوت گاہوں (خانقاہوں) ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو تصوف، فرد اور جماعت دونوں کے وجود کا منکر، لہٰذہ انسانی زندگی کے متعلق بدترین اور سب سے زیادہ نقصان رساں تصور ہے۔ عیسائیت اسی تصور کی علمبردار تھی۔ اس کے خلاف تو تعمرنے صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ اس کی تحریک کا نام ہی احتجاجیت Protestantism ہے۔

سیاسی میدان میں افلاطون کی جمہوریت کے خلاف ملوکیت (Monarchy) کے تصور نے سر ابھارا جس میں رعایا (افراد مملکت) کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ حیثیت صرف بادشاہ (سلطان) کی ہوتی ہے۔ افراد مملکت سب اس کے حکم کے بندے اور خدام ہوتے ہیں۔

اس ملوکیت کے خلاف انقلاب فرانس صدائے احتجاج بن کر ابھرا جس نے پھر جمہوریت کا نعرہ بلند کیا۔ اس کا ردعمل ہیگل کا سیاسی فلسفہ ہے جس نے اسٹیٹ (مملکت) کو معبود بنا کر رکھ دیا اور افراد مملکت کو اس کا پرستار۔ اس فلسفہ کی رو سے

مملکت ایک مکتفی بالذات انتہائے مطلق ہے۔ جس کے نزدیک خیر و شر کی کوئی مستقل قدر نہیں۔ زمین پر خدا کا وجود صرف مملکت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خدا نہیں۔

فاشزم، کمیونزم، نیشنلزم، سوشلزم۔ سب اسی فلسفہ اجتماعیت کے مظاہر ہیں۔ جس کی رو سے فرد کا وجود صرف معاشرہ کے تحفظ کے لئے ہے۔ اس کے علاوہ اس کی زندگی (بلکہ وجود) کا کوئی مقصد نہیں۔ فرد کا مقصودِ حیات، مملکت کے دیوتا کے استھان پر بھینٹ چڑھ جانا ہے اور بس۔

اسی فلسفہ کا ردعمل، اب، اس ماڈرن تصوف کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے جسے دور حاضرہ کے اکثر مفکرین اور سائنسدان، اپنی آخری عمر میں بطور فیشن اختیار کر رہے ہیں۔ یہ درحقیقت، زندگی کے اس اہم سوال کو حل نہ کر سکنے کا عملی اعتراف اور حقائق سے چشم پوشی کا مقدس بہانہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کشمکشِ حیات سے فرار اور شکست خوردگی کا مظاہرہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ذہن انسانی، اس اہم سوال کے حل کی تلاش میں کس طرح افراط و تفریط کے جھولے جھولتا چلا آ رہا ہے۔ اور آج تک کسی اطمینان بخش منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ

(۱) خدا نے تمام بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسانی بچہ۔ بحیثیت اس کے کہ وہ انسانی بچہ ہے مستحقِ عزت و توقیر ہے۔

(۲) ہر فرد اپنی الگ انفرادیت رکھتا ہے اور اس کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ جس نے کسی ایک فرد کو ناحق تلف کر دیا۔ یوں سمجھئے کہ اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک فرد کی زندگی کا سامان بہم پہنچا دیا یوں سمجھئے جیسے اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندہ کر دیا۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما زندگی کا مقصد ہے۔ اور چونکہ یہ نشوونما معاشرہ (جماعت) کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔ اس لئے فرد کی تکمیلِ ذات کے لئے معاشرہ کا وجود لاینفک ہے۔

(۴) معاشرہ کا فریضہ ہر فردِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہے۔ اس لئے معاشرہ کا کام اتنا ہی نہیں کہ تمام افرادِ معاشرہ کی طبعی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے، بلکہ یہ بھی کہ وہ ہر ایک کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا انتظام کرے اور ہر ایک کے لئے یکساں مواقع مہیا کرے۔

(۵) معاشرہ نام ہے اس ہیئتِ اجتماعیہ کا جس میں وہ تمام افراد جو مندرجہ بالا اصولوں کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، بطیب خاطر (یعنی دل کی رضامندی سے۔ بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے) باہم مل کر زندگی بسر کرنے کا عزم کریں۔

(۶) معاشرہ کا کام اشیاء کا نظم و نسق ہوگا نہ کہ انسانوں پر حکومت کرنا۔ اس لئے کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں (خواہ اسے حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ مل جائے) کہ وہ کسی دوسرے فرد سے اپنا حکم منوائے۔ لہٰذا اس معاشرے میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ اور محتاجی و محکومی ہی وہ چٹانیں ہیں جن سے ٹکرا کر انسانی ذات کی کشتی پاش پاش ہوتی ہے۔

(۷) اس معاشرے میں تمام افراد باہمی مشاورت سے ان غیر متبدل قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے وحی کے ذریعے عطا فرمایا اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسے اطاعتِ قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی زندگی اور اسکی ذات اللہ تعالیٰ کی الوہیاتی توانائی پر متفرع ہے۔ اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے مراد درحقیقت خود انسانی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہے (جس طرح، مثلاً پیاس کے وقت پانی پینا کسی کے حکم کی تعمیل نہیں بلکہ انسان کے ایک طبعی تقاضا کی تسکین ہے)

(۸) ظاہر ہے کہ اس معاشرہ کی سالمیت، تحفظ اور استحکام، جو افراد کی ذات کی تکمیل کا ذریعہ ہے، افراد کا فریضہ ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاشرہ کے استحکام اور تحفظ کے لئے کسی فرد کی ذات (Personality) کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ فرد اس معاشرہ کی حفاظت میں اپنی جان تک تو دے سکتا ہے لیکن اس کی ذات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ واضح ہے کہ انسانی جان مقصود بالذات نہیں، یہ ایک بلند نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات، انسانی ذات کی تکمیل ہے۔ لہٰذا اس عظیم نصب العین کے حصول کی خاطر، اس ذریعہ کو استعمال کر لینا (یعنی بوقتِ ضرورت جان تک دے دینا) جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی

ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رو سے فرد اور معاشرہ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہی وہ تعلق ہے جسے علامہ اقبال نے اپنی مثنوی کے دوسرے حصہ میں اپنے مخصوص، دلکش اور حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ مثنوی کے اس حصہ کا نام ہے رموزِ بیخودی۔ یہ بیخودی" اہلِ تصوف کی نہیں جس سے مراد انسانی ذات کا ذاتِ خداوندی میں جذب ہو کر اپنے آپ کو مٹا دینا ہوتا ہے۔ اس "بیخودی" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی مساعیٔ حسنہ کو اس قسم کے معاشرہ کے استحکام و ارتقاء میں صرف کرتا ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور اس طرح (شاعرانہ اصطلاح میں) معاشرہ

میں گم ہو کر اپنی ذات کا استحکام کرے۔ "معاشرہ میں گم ہونے" کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی ذات کو معاشرہ پر قربان کر دے۔ فنا کر دینا تو ایک طرف اگر معاشرہ کی خاطر انسانی ذات کا ایک ذرہ بھی مکروہ پڑ جائے تو وہ معاشرہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اسے برقرار رکھا جائے۔ اقبال نے جہاں معاشرہ (جماعت) کی اہمیت پر زور دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھ لے کہ اس کی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر، زاویوں اور خانقاہوں میں ہو سکتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما صرف معاشرہ کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے معاشرہ کی قدر و قیمت ہے۔ اگر معاشرہ کسی وقت بھی فرد سے بڑھ کر قدر و قیمت اختیار کر لیتا ہے[1]۔ تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں رہتا۔ طاغوتی نظام بن جاتا ہے جس کا مٹانا ہر اس شخص کا فرض ہو جاتا ہے جو شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کا احساس رکھتا ہے۔

اس تمہیدی تشریح کے بعد اصل کتاب کی طرف آیئے۔ چونکہ اس کتاب میں معاشرہ۔ جماعت۔ ملت کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے اس لئے علامہ اقبال نے اس کی ابتدا

پیشکش بحضور ملت اسلامیہ

سے کی ہے۔ اقبال کو اس ملتِ شریفہ کے ساتھ جس انداز کی والہانہ محبت ہے اس کا اندازہ عرفی کے اس شعر سے لگ سکتا ہے جسے اقبال نے سرعنوان درج کیا ہے۔ یعنی

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن نیست اگر باد گرے ہست

اس کے بعد "پیشکش" کی ابتدا ہوتی ہے۔

ملتِ اسلامیہ کے تعارف و تعریف میں پہلا شعر ہے

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد

حقیقت یہ ہے کہ اگر اقبال اور کچھ بھی نہ کہتے اور یہی ایک شعر کہہ دیتے تو ملت اسلامیہ کی صحیح تعریف اور پوزیشن کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ "خاتمِ اقوام" اور جس پر ہر آغاز کا اختتام کر دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں واجب الاحترام قوم اور کونسی ہو سکتی ہے!

"خاتمِ اقوام" میں ایک خاص نکتہ ہے۔ قرآن کی رو سے قوم کی تشکیل و تقویم نہ رنگ و نسل کی بنا پر ہوتی ہے۔ نہ زمین اور وطن کی نسبت سے۔ اس کی تشکیل ہوتی ہے آئیڈیل کے اشتراک کی بنا پر۔ یعنی جن افراد میں وجہِ جامعیت اور قدرِ مشترک ایک خاص آئیڈیل ہو، وہ ایک خاص قوم کے افراد کہلاتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رو سے، صحیح آئیڈیل صرف وحی کی رو سے مل سکتا ہے اور وحی انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتی ہے

---

[1] if it assumes a higher value than the individual

اس لئے وحی کی متبع قوم کی نسبت اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کی طرف آمدہ وحی کی اتباع سے وہ قوم متشکل ہوتی ہے۔ مثلاً قوم موسٰیؑ سے مراد ہے وہ قوم جو اس وحی کی اتباع کرتی ہے جو حضرت موسٰیؑ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح قوم محمدؐ سے مفہوم ہے وہ قوم جو قرآن کی متبع ہے چونکہ نبی اکرمؐ خاتم الانبیاء تھے اس لئے حضورؐ کی امت خاتم الاقوام ہے۔ نہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آئے گا نہ کوئی نئی امت متشکل ہوگی۔ اس لئے ملت اسلامیہ کو خاتم الاقوام کہا گیا ہے۔

دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ ہی کی تشریح ہے۔ وحی کا وہ سلسلہ جس کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوا تھا، اس کا اختتام نبی اکرمؐ پر ہو گیا۔ اس طرح ہر خیر اپنے ارتقائی منازل طے کرتے کرتے تکمیل تک پہنچ گیا۔

دوسرا شعر ہے۔

اے مثالِ انبیاء پاکانِ تو
ہمسگر دلہا جگر چاکانِ تو

پہلے مصرعہ میں غالباً اُس عربی فقرہ کی طرف اشارہ (تلمیح) ہے جسے عام طور پر بطور حدیث بیان کیا جاتا ہے یعنی علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں)۔ ہمارے نزدیک یہ حدیث وضعی ہے اور رسول اللہؐ کی طرف غلط منسوب۔ اس لئے کہ مومنین کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو وہ کبھی انبیاء کی مثل نہیں ہو سکتے۔ نبوت ایک وہبی عطیہ ہے جسے کوئی شخص اکتساباً حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کوئی غیر نبی نبی کا مثل نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبال اس فقرہ کو محض تقلیداً لکھ گئے ہیں۔ وہ اگر اس کے مضمرات پر غور کر لیتے تو اس کی جگہ کچھ اور لکھتے۔ شاعری میں تو ایسی باتوں کو روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ علامہ اقبال اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے (وہ شاعری کو اپنے آپ پر تہمت قرار دیتے ہیں) اس لئے ہم ان کے ہر قول کو قرآن کی محک پر پرکھتے ہیں اور جہاں کوئی ذرا سا بھی سقم نظر آئے اس کی طرف اشارہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

البتہ اس شعر کا دوسرا مصرعہ بڑا ہی پیارا ہے — ہمسگر دلہا جگر چاکانِ تو

ان تعریفی اشعار کے بعد وہ اس ملت کی موجودہ روش کی طرف آتے ہیں اور کس حیرت و تاسف سے کہتے ہیں کہ

اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ

خدا نے تمہارا مقصود و مطلوب "کعبہ" قرار دیا تھا یعنی وہ مرکز جس سے قوانینِ خداوندی کی تنفیذ ہوتی تھی۔ لیکن تم نے اُدھر سے منہ موڑ کر عجمی تصوراتِ حیات کو اپنا محبوب بنا لیا! کس قدر قابلِ افسوس ہے یہ روش!!

اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو — اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
ہمچو موجِ آتش تہ پا می روی — "تو کجا بہرِ تماشا می روی"

تیرا مقام اتنا بلند اور منزل اس قدر رفیع الشان تھی کہ آسمان تیرے کوچے کی گرد تھا۔ تو مرجعِ انام اور مرکزِ اقوام تھی۔ ساری دنیا اپنی

امیدوں اور آرزوؤں کے بر آنے کے لئے تیرے دروازے کی طرف تکتی تھی۔ ہر مشکل کے وقت نوعِ انسانی کو اس کا انتظار رہتا تھا کہ تیری طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔ یہ تیرا مقام تھا۔ لیکن تو نے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا کہ بجائے اس کے کہ دنیا تیری طرف آتی تو نے دوسروں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ اور اس اضطراب و سرعت کے ساتھ، جیسے کسی کے پاؤں تلے چنگاری آگئی ہو۔

کس قدر تاسف انگیز ہے یہ تفاوت! اب کرنے کا کام یہ ہے کہ

رمزِ سوز آموز از پروانۂ ‌ ‌ ‌ در شررِ تعمیر کن کاشانۂ

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش ‌ ‌ ‌ تازہ کن با مصطفےٰ پیمانِ خویش

تو پروانے سے سیکھ کہ عشق میں کس طرح خاموشی سے جان دے دیا کرتے ہیں۔ اور اس طرح دنیا کی تخریبی قوتوں کے نرغے میں جلنے کے باوجود، اپنے اجڑے ہوئے مرکز کی از سرِ نو تعمیر کر لے۔ یعنی اپنے اندر پھر سے وہی حرارتِ ایمان پیدا کر۔ اور اس طرح وہ عہد جو تو نے نبوتِ محمدیہ سے باندھا تھا، اسے محکم و استوار کر لے۔ اسی میں تیری زندگی کا راز اور عظمت و رفعت کا نشان ہے۔

خاطرم از صحبتِ ترسا گرفت

تا نقابِ روئے تو بالا گرفت

میں جب عجمی تصورات سے بیزار اور غیر قرآنی نظریاتِ زندگی سے رنجیدہ خاطر ہو گیا تو مجھ پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ملتِ اسلامیہ کی حقیقی صورت کیسی ہے جس پر عجم نے اس قدر دبیز اور نگاہ فریب پردے ڈال رکھے ہیں۔ لہٰذا میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ان پردوں کو چاک کر کے، ملتِ اسلامیہ کا روئے نگار وجہ تابانیٔ عالم بنا دوں گا۔

ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت

داستانِ گیسو و رخسار گفت

میرے ہمعصر شعراء (دوسرے متفکرین) غیروں کے حسن و جمال کے قصیدے لکھتے تھے اور کچھ زلف و کاکل کی فرضی داستانوں میں الجھے ہوئے تھے۔

بر درِ ساقی جبیں فرسود او

قصۂ مغ زادگاں پیمود او

کچھ شرابِ معرفت کے نشہ میں سرمست (حافظ و خیام کی طرح) ساقی کے دروازے پر سجدہ ریز تھے۔ اور عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی منزل تک پہنچنے کے درپے۔ لیکن میں نے جب حقیقت کو پا لیا تو میری حالت یہ ہو گئی کہ

من شہیدِ تیغِ ابروئے توام

خاکم و آسودۂ کوئے توام

اب مجھے عشق ہے تو اسی ملت کا۔ نسبت ہے تو اسی کے مقصود و مطلوب سے۔ میں خاکِ رہگذر ہوں لیکن مجھے اس ملت ہی کے کوچے میں وہ سکون و اطمینان میسر ہے جو جنت میں بھی نہ ہو گا۔

از ستائش گستری بالاترم
پیشِ ہر دیواں فرو ناید سرم

میں ارباب جاہ و حشم کی قصیدہ خوانیاں نہیں کر سکتا۔ میں کسی صاحب اقتدار کے حضور اپنا سر نہیں جھکا سکتا۔ میں اپنے آپ کو اس سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
وز سکندر بے نیازم کردہ اند

میری شاعری ایک آئینہ ہے جس میں ہر شخص کو بلا کم و کاست اپنی حقیقی صورت نظر آسکتی ہے۔ یہ کیفیت میرے داخلی جذبات، استعداد کی پیدا کردہ ہے اس کے لئے میں خارجی اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں۔

بارِ احساں برنتابد گردنم
در گلستاں غنچہ گردد دامنم

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں کسی کا زیر بارِ احسان نہیں ہونا چاہتا۔ میری طبیعت اس سے اِبا کرتی ہے۔ میری کیفیت یہ ہے کہ

مرا از شکستن چنیں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

میری قناعت کا یہ عالم ہے کہ میں پھولوں سے بھرے ہوئے صحن چمن میں اپنا دامن سمیٹ لیتا ہوں۔

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آبِ خود می گیرم از سنگِ گراں

میں ناسازگاریِ حالات سے گھبرا کر خس و خاشاک کی طرح ذلت و بیکسی کی زندگی بسر نہیں کرتا۔ میں سخت کوش اور جفاکش ہوں۔ جس طرح فولاد پتھر کی فسان سے تصادم کے بعد اپنی آب و تاب حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح میں بھی پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر اپنے لئے آبِ زندگی پیدا کرتا ہوں۔

گرچہ بحرم۔ موجِ من بیتاب نیست
بر کفِ من کاسۂ گرداب نیست

میں ایک وسیع و عریض سمندر ہوں۔ لیکن نہایت خاموش اور پُرسکون۔ یونہی ذرا ذرا سی بات پر بپھر کر تلاطم انگیز نہیں ہو جاتا۔ نہ ہی دوسروں کے سامنے پر جھولیاں پھیلاتا پھرتا ہوں۔ سکون و ثبات، قناعت، و استغناء میرے عناصرِ ترکیبی ہیں۔

پردۂ رنگم شمیمے نیستم
صیدِ ہر موجِ نسیمے نیستم

میں ایک پردۂ رنگ ہوں جو اپنے مقام پر بخود خزیدہ، محکم و استوار ہے موج شبو کی طرح بے وزن اور پریشان نہیں کہ ہوا کا جو جھونکا چاہے مجھے اپنے ساتھ لے اڑے۔ میں ہرجائی نہیں۔ اصول پرست ہوں

در شرار آبادِ ہستی اخگرم
خلعتے بخشد مرا خاکسترم

میں آتشکدۂ ہستی میں ایک دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہوں۔ جو اپنی راکھ سے اپنی قبا خود تیار کرتا ہے اپنی ستر پوشی کے لئے دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی کا نام اقبال کی اصطلاح میں قلندری ہے۔ اخگر و خاکستر کے استعارہ کو اقبال نے دوسری جگہ ایک اور انداز میں پیش کیا ہے جہاں کہا ہے کہ

ارتباطِ حرف و معنی۔ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

بہرحال ان اشعار میں اقبال نے کہا ہے کہ میں قلندرانہ زندگی بسر کرتا ہوں اور کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔ میں ہر بلند چوکھٹ سے بے نیازانہ اور سرفرازانہ مستانہ وار گذر جاتا ہوں۔ میں شاخِ نہالِ سدرہ ہوں خس و خاشاک چمن نہیں ہوں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھے اپنے سامنے سرنگوں نہیں کر سکتی۔ نہ شدت احتیاج مجھے کسی کے دروازے پر جھولی پھیلانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ لیکن

بر درت جانم نیاز آوردہ است
ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است

میری جسور و غیور جان اے ملت اسلامیہ تیرے دروازے پر ہدیۂ تسلیم لے کر حاضر ہوئی ہے۔ میری متاعِ حیات سوز و گداز اور درد و داغ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ساری متاعِ بے بہا تجھ پر نچھاور کرنے کے لئے آیا ہوں۔

ز آسمانِ آبگوں یم می چکد	بر دلِ گرمم دمادم می چکد
من ز جو باریکتر می سازمش	تا بہ صحنِ گلشنت اندازمش

میرے قلب پر الہامات کی بارش ہوتی ہے۔ میرے افق ذہن پر نادر تصورات و خیالات کا پیہم و مسلسل نزول ہوتا ہے۔ یہ خیالات قطرہ بہ قطرہ نازل نہیں ہوتے سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے آتے ہیں میں انھیں اپنے سینہ میں بند رکھتا ہوں اور اس آب حیات کو ایک جوئے نغمہ خواں کی شکل میں ملتِ اسلامیہ کے صحنِ چمن کی آبیاری کے لئے بھیجتا رہتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ میں اس ملت کے لئے یہ کچھ کیوں کرتا ہوں؟

زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی
ہمچو دل اندر کنارِ ماستی

اس لئے کہ تو میرے دوست (نبی اکرمؐ) کی چہیتی امت ہے تو میرے پہلو میں قلب کی طرح ہے۔

عشق تا طرحِ فغاں در سینہ ریخت — آتشِ او از دلم آئینہ ریخت
مثلِ گل از ہم شگافم سینہ را — پیشِ تو آویزم ایں آئینہ را

عشق نے میرے سینہ میں آہ و فغاں کی آگ بھڑکا دی۔ اس سے میرا قلب آئینہ کی طرح بن گیا۔ میں نے پھول کی طرح اپنے سینہ کو چیرا ہے۔ اور اس میں سے اس آئینہ کو نکال کر تیرے سامنے رکھدیا ہے۔

تا نگاہے افگنی بر روئے خویش
می شوی زنجیری گیسوئے خویش

تاکہ تو اس آئینہ میں اپنی حقیقی شکل و صورت کو دیکھ لے۔ اور اس طرح دوسروں کے نگاہ فریب جلووں سے صرفِ نظر کر کے خود اپنے حسن کا متوالا ہو جائے۔ تجھ سے زیادہ حسین خوبرو دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن چونکہ تیرا اپنا حسن عجمی پردوں میں مستور ہو چکا ہے اس لئے تو غیروں کے پیچھے پھر رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے آئینہ فکر سے تجھے تیری حقیقت سے آگاہ کر دوں تاکہ تو اپنی قدر پہچان لے اور پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لے اس مقصد کے لئے

باز خوانم قصۂ پارینہ را
تازہ سازم داغہائے سینہ را

میں پھر تیری بھولی بسری داستان کو دہراتا ہوں اور اس طرح تیرے سینہ کے داغوں کو پھر سے ہرا کرتا ہوں۔ تاکہ اس میں پھر وہی درد و سوز پیدا ہو جائے۔

ملت سے اس طرح تخاطب کے بعد دوسرے بند میں کہتے ہیں۔

از پئے قومِ ز خود نامحرمے
خواستم از حق حیاتِ محکمے

میں اُس قوم کے لئے جو اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی ہے خدا سے محکم اور استوار زندگی کا سوالی ہوں۔ میں امتِ مسلمہ کے لئے خدا سے ثبات و استحکام کا طالب ہوں۔

در سکوتِ نیم شب نالاں بدم
عالم اندر خواب و من گریاں بدم

ملت کے لئے یہ تڑپ اور آرزو مجھے ہر وقت مضطرب و بے چین رکھتی ہے۔ خاموش راتوں کی تنہائیوں میں جب سارا عالم سو جائے تو میں اٹھ اٹھ کر روتا ہوں۔ اور خدا سے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔

جانم از صبرِ سکوں محروم بود
درد من یا حی و یا قیوم بود

ایسے عالم میں، میں خدائے حی و قیوم کو پکارتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تو مُردوں کو زندگی عطا کرنے والا اور بے سہاروں کو سہارا بخشنے والا ہے تو ملت اسلامیہ کے جسد بے روح میں خونِ زندگی دوڑا دے اور اسکی بے چارگی و ناکسی کو تاب و توانائی سے بدل دے۔

آرزوئے داشتم خوں کردمش
تا زرہ دیدہ بیروں کردمش

میری یہ آرزو تھی جو خون ہو کر آنکھوں کے راستے ٹپک پڑی۔ یہ اچھا ہوا۔ اس لئے کہ

سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا
از سحر دریوزۂ شبنم تا کجا؟

گلِ لالہ کی طرح مسلسل جلتے رہنا، کب تک ہو سکتا ہے؟ اور کب تک صبح کی خنکی سے شبنم کے قطرات کی بھیک مانگی جا سکتی ہے؟ میں نے اس صورتِ حالات سے تنگ آ کر یہ شکل اختیار کی ہے کہ

اشکِ خود بر خویش می ریزم چو شمع
با شبِ یلدا در آویزم چو شمع

میں اپنے دل کا خون کر کے، خود ہی اپنا اشک اپنی آنکھوں کے راستے اپنے دامن پر ٹپکا لیتا ہوں۔ اور شمع کی طرح، رات کی تاریکیوں سے مصروفِ پیکار رہتا ہوں۔

جلوہ را افزودم و خود کاستم
دیگراں را محفلے آراستم

میں نے (شمع کی طرح) اپنے آپ کو گھلا گھلا کر روشنی کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اور اس طرح دوسروں کے لئے انجمن آرائی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

یک نفس فرصت ز سوزِ سینہ نیست
ہفتہ ام شرمندۂ آدینہ نیست

میں مسلسل اور پیہم جلتا رہتا ہوں۔ اس طرح مسلسل گویا میرے زمان (Time) میں ابتدا و انتہا کا سوال ہی نہیں رہا۔ عام طور پر شنبہ کے روز سے ہفتہ (Week) شروع ہوتا ہے اور جمعہ پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن میرا ہفتہ ایسا ہے جس میں کبھی جمعہ کا دن ہوتا ہی نہیں۔ اس کا تسلسل بدستور قائم رہتا ہے۔

جانم اندر پیکرِ فرسودۂ
جلوۂ آہے است گرد آلودۂ

میرے نحیف و نزار جسم کے اندر میری جان، بس یوں سمجھئے جیسے ایک نرم و نازک آہ، مٹی میں ملی ہوئی ہو۔

چوں مرا صبحِ ازل حق آفرید
نالہ در ابریشمِ عودم تپید

یہ آہ و فغاں میری فطرت کے اندر پیوست کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

نالۂ افشا گر اسرارِ عشق

خونبہائے حسرتِ گفتارِ عشق

یہ وہ نالہ ہے جس سے عشق کے تمام راز افشا ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عشق میں انسان کو ہمیشہ یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ میں کبھی دل کی بات زبان تک لاسکوں، یہ نالہ و فریاد اس خوں گشتہ حسرت کا خون بہا ہے۔

فطرتِ آتش دہد خاشاک را

شوخیٔ پروانہ بخشد خاک را

یہ نالہ خس و خاشاک کو آگ کی فطرت عطا کر دیتا ہے۔ اور خاک کے ذرہ میں پروانے کی شوخی پیدا کر دیتا ہے۔

عشق را داغِ مثالِ لالہ بس

در گریبانش گلِ یک نالہ بس

اور عشق اس کے سوا کچھ اور چاہتا بھی نہیں۔ وہ اپنے دل میں، لالہ کی طرح ایک داغ چاہتا ہے۔ اور اپنے گریبان میں (گلِ لالہ کی جگہ) "گلِ نالہ"

من ہمیں یک گل بدستارت زنم

محشرے بر خوابِ سرشارت زنم

اے ملتِ اسلامیہ! میں اسی قسم کا ایک "گل نالہ" لایا ہوں تاکہ اُسے تیرے زیب دستار کر دوں۔ اور اس طرح ایک حشر برپا کر کے تجھے تیرے خواب گراں سے بیدار کر دوں۔ میرے آہ و نالہ سے تیرے خوابوں میں قیامت برپا ہو جائے اور تو پھر سے جاگ اٹھے۔

تا ز خاکت لالہ زار آید پدید

از دمت بادِ بہار آید پدید

تاکہ تیرے جاگنے سے بہاریں جاگ اٹھیں اور صحنِ چمنِ کائنات پھر سے "دامانِ باغبان و کفِ گلفروش" بن جائے۔

اس آرزو کے ساتھ یہ پیشکش بحضورِ ملت، ختم ہوتی ہے۔

اقبال اور قرآن

(از:- پرویز)

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت:- دو روپے

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

(۱۱)

اس مضمون کی گذشتہ دس اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ، والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ، بھائی بہنوں کو آپس میں اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض وواجبات کیا ہیں؟ نیز یہ کہ ایک مسلمان کو اپنے عام قرابت داروں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور ان کے حقوق وواجبات کیا ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ (طلوع اسلام)

قرابت دار

(سلسل)

ترکہ کے علاوہ بھی ترکہ کی تقسیم کے وقت اگر ایسے قرابت دار بھی موجود ہیں جن کا اس میں وصیت یا قانون وراثت کے مطابق کوئی حصہ نہ نکلتا ہو تو ان کو تبرعاً کچھ نہ کچھ ضرور دیدینا چاہیئے اور مناسب گفتگو کے ذریعہ ان سے اسکی معذرت کردینی چاہیئے کہ اس سے زیادہ ان کی کوئی خدمت نہیں کی جاسکی۔ لیکن ایسا کچھ تمام ورثاء کی رضامندی سے کیا جانا چاہیئے اور اگر ورثاء میں یتیم اور نابالغ بچے بھی ہوں تو ان کے حصے سے نہیں کرنا چاہیئے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (۴/۸)

اور جب ترکہ کی تقسیم کے وقت قرابت دار اور یتیم اور مسکین لوگ بھی موجود ہوں تو انھیں ترکہ میں سے کچھ دیدینا چاہیئے اور ان سے مناسب گفتگو کرکے معذرت کردینی چاہیئے۔

بہرحال قرابت داروں کا ہمیں ہر حال میں خیال رکھنا چاہیئے۔ قرآن کا یہ عمومی حکم تو ہر حالت میں نافذ العمل رہے گا ہی کہ اگر معاشرہ میں کچھ

لوگ ایسے ہیں جو ضرورت مند ہیں اور بنیادی ضروریات تک سے محروم ہیں اور خدا نے آپ کو اتنی وسعت اور گنجائش دی ہے کہ اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے کے بعد آپ کے پاس کچھ بچ جاتا ہے تو اس بچے ہوئے حصہ کو معاشرہ کے ان ضرورت مند بھائیوں کی کمی پورا کرنے میں خرچ کر دینا چاہیئے۔ اس عمومی حکم میں والدین اور قرابت داروں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ
الْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○ (۲/۲۱۵)

اے پیغمبرِ اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ مفادِ عام کے لئے کھلا رکھیں اور خرچ کر دیں۔ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ (یہ تو کوئی پوچھنے کی بات نہیں۔ البتہ) جتنا کچھ مال تم مفادِ عام کے لئے کھلا چھوڑ دو گے اور خرچ کرو گے تو وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ تم جو کچھ بھی اچھا کام کرو گے خدا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی جا سکتی کہ کتنا کچھ مفادِ عام کے لئے کھلا رکھا جائے اور اس ضمن میں کتنا کچھ خرچ کیا جائے۔ کیونکہ اس کا دارومدار معاشرے کے اقتصادی حالات پر ہے۔ اگر معاشرہ کی اقتصادی حالت اس درجہ ناگفتہ بہ اور پست ہو کہ زیادہ تر لوگ اپنی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہوں تو معاشرہ ایسی حالت میں فارغ البال لوگوں کی بعض بنیادی ضروریات تک پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اور اگر معاشرہ کی اقتصادیات بہتر بنیادوں پر استوار ہوں اور بہت کم لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ہوں تو ایسی صورت میں معاشرہ اپنے افراد کی ضرورت کے زیادہ اموال کے معاملے میں نسبتاً ڈھیلا بھی برت سکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کے عہدِ ہمایوں میں جب کہ مہاجرین کا مسئلہ خصوصی توجہ کا محتاج تھا تو رسول اللہ صلعم نے تمام مہاجرین کو انصار میں تقسیم کر دیا تھا اور ان کی نصف ملکیت میں شریک کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں ——— زمینوں کو بٹائی پر دے کر کاشت کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ حکم دیدیا گیا تھا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو جس میں وہ خود کاشت نہ کر سکے تو وہ اسے اپنے کسی ایسے بھائی کے حوالے کر دے جس کے پاس زمین نہیں ہے۔ ان احکامات کی تصریح بخاری اور مسلم کی روایات میں موجود ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب پیہم فتوحات کی وجہ سے معاشرہ کی حالت اقتصادی طور پر کافی مضبوط ہو چکی تھی تو ان احکام میں نرمی (RELAXATION) کر دی گئی تھی جیسا کہ مشہور مؤرخ امام طبری نے سنہ ۳۰ھ کے حالات میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا ان امور کی کوئی تحدید و تعیین نہیں کی جا سکتی۔ اس کا فیصلہ معاشرہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہر زمانہ کا مرکزِ ملت خود ہی کرے گا۔ البتہ قرآن کریم اس باب میں ہماری رہنمائی کرے گا کہ جتنا کچھ مفادِ عام کے لئے کھلا چھوڑ دینے کا حکم اپنے زمانہ کا مرکزِ ملت دے وہ کن لوگوں کے لئے ہو گا۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ مفادِ عام کے لئے کتنا کچھ کھلا چھوڑ دیا جائے قرآن کریم نے یہی بتلانے پر اکتفا کیا ہے کہ وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہو گا۔

قرابت داروں کے حقوق ذاتی اموال میں ہیں معاشرہ کے اموال میں نہیں

لیکن قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک

کے یہ تمام احکام ان اموال سے متعلق ہیں جو ہماری ذاتی ملکیت میں ہوں ان اموال کے متعلق نہیں ہیں جو معاشرہ کی ملکیت میں ہوں۔ لیکن ہماری تحویل میں دے دیئے گئے ہوں۔ ایسے اموال ہماری ملکیت نہیں ہوتے ہم ان کے صرف امین ہوتے ہیں۔

قرابت داروں سے محبت

قرآنی معاشرہ قرابت داروں کے ساتھ صرف حسن سلوک، خبر گیری اور امداد و اعانت ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی محبت اور قلبی وابستگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ قرآن کی نظر میں قرابت داروں کے ساتھ محبت اور قلبی وابستگی ایک ایسا جذبہ ہے جو مسلمان تو مسلمان ہر انسان میں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلعم سے کہتا ہے کہ ذرا آپ ان کفار و مشرکین سے جو دن رات تمہاری ایذا رسانیوں میں منہمک رہتے ہیں پوچھئے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا مگر کیا میرے لئے قرابت داری کے وہ تعلقات و مراسم بھی ختم ہو گئے جو عرب کے عام معاشرہ میں پائے جاتے ہیں اور جو عربوں کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۚ (۴۲/۲۳)

اے پیغمبر اسلام! آپ کہیئے کہ میں تم سے رسالت پر کوئی اجر تو نہیں مانگتا۔ مگر کیا قرابت داری کی محبت بھی ختم ہو گئی (اور تمہارے خون بھی سفید ہو گئے؟)

لیکن حدود الٰہی کے اندر

قرابت داروں کے ساتھ یہ محبت اور حسن سلوک حدود الٰہی کے اندر رہتے ہوئے ہی ہونا چاہیئے۔ اگر قوانین خداوندی کا تقاضا ہو کہ قرابت داروں سے محبت اور وابستگی ختم کر دی جائے۔ اور ان کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہ رکھا جائے تو وہاں تعلقات کو ختم کر دینا ہوگا۔ چنانچہ جو لوگ اسلامی نظام کی مخالفت میں کمر بستہ ہو کر محاذ بنا لیں اور اللہ اور اس کے رسول کے تجویز کردہ نظام کو ناکام بنانے پر تل جائیں تو ایسے لوگوں سے پھر کوئی محبت اور دلی وابستگی کا تعلق باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (۵۸/۲۲)

اے پیغمبر اسلام! تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوا نہیں پائے گا، جو اللہ اور اسکے رسول کے نظام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہوں۔ اگرچہ وہ ان کے باپ بیٹے بھائی یا خاندان کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا قرابت دار اگر اسلامی نظام کے خلاف صف آرا ہو جائیں تو ان سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رکھا جائے گا۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت اور وابستگی کا تعلق رکھنا ایک مسلمان کا اسلامی ہی نہیں بلکہ انسانی فریضہ ہے۔ اسے پھر سمجھ لیجیے کہ قرابت داروں سے حسن سلوک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا پہلا قدم ہے۔ اسے وسیع ہوتے ہوتے اس طرح حدود فراموش ہو جانا چاہیئے کہ ساری دنیا کے انسان ایک برادری کے افراد بن جائیں اور اس طرح کان الناس امۃ واحدۃ کا منظر عملاً سامنے آ جائے۔

اقربا نوازی

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنی نقطۂ نظر سے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا پہلا

قدم ہے۔ اس کا منتہائے مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا اقربا نوازی اور خویش پروری کی جو وبا آج ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے ڈال رہی ہے۔ وہ قطعاً اسلامی حکم نہیں ہے۔ اس میں حقداروں کے حقوق کو تلف کر کے غیر حقداروں کو محض اس بنا پر ترجیح دی جاتی ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار سے رشتۂ قرابت رکھتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا یہ اصولی حکم ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا ..... فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ..... (۴/۱۳۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! انصاف کی پوری پوری نگہداشت کرنے والے اور فقط خدا کے لئے نگرانِ کار بنو۔ خواہ یہ فیصلہ اور نگرانی تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف۔ خواہ یہ امیر کے حق میں جائے یا غریب کے۔ تم اس فیصلہ پر کبھی اپنے جذبات اور رجحانات کو اثر انداز نہ ہونے دو۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم عدل کر سکو گے۔

عدل کا حکم صرف اپنوں کے ساتھ نہیں بلکہ غیروں کے ساتھ بھی حتیٰ کہ دشمنوں کے ساتھ بھی ہے۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دو۔

انتخاب کا معیار

کسی خدمت کے لئے انتخاب کا معیار اس کی قابلیت اور صلاحیت ہونی چاہیئے۔ رشتہ داری اور قرابت نہیں۔ علمی قابلیت، جسمانی صلاحیت اور کیریکٹر کی اہلیت اہم ترین خصوصیات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی نے جب اپنے والد بزرگوار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش کی ہے تو انہوں نے ان میں سے دو خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ انہوں نے عرض کیا تھا کہ

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (۲۸/۲۶)

وہ بہترین خدمت گار اور ملازم جو تم منتخب کر سکتے ہو وہی ہو سکتا ہے جو جسمانی لحاظ سے قوی اور کیریکٹر کے لحاظ سے امانت دار ہو (حضرت موسیٰ میں یہ دونوں باتیں ہیں)

اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے لئے طالوت کو فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا اور بنی اسرائیل کے سرداروں نے اعتراض کیا کہ وہ تو ایک غریب آدمی ہے اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی یا نسبی جاہ و منزلت کی کوئی چیز نہیں ہے تو اس زمانہ کے نبی کی معرفت زبانِ وحی نے طالوت کی صحت انتخاب کے لئے ان کی جو خصوصیات بیان کی تھیں ان کی علمی قابلیت اور جسمانی توانائی کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا تھا۔

زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷)

طالوت میں علمی قابلیت اور جسمانی توانائی دونوں وافر طور پر موجود تھیں

(باقی صـ ۵۳ پر دیکھئے)

Superior Plastic
Goods & Crockery
PLASTIC CROCKERY IS HYGIENIC TO
AND IS MORE DURABLE THAN
WE ALSO MANUFACTURE FLEXIBLE
SHEET PRODUCTS LIKE WALLETS, PURSES
HAND BAGS, NOTE BOOK COVERS ETC
PLASTIKO
INDUSTRIES
SOUTH NAPIER ROAD VALIKA CHAMBERS

ہے ضد کی بات اور.....

محترم پرویز صاحب نے طلوع اسلام کنونشن (منعقدہ نومبر ۱۹۵۶ء) میں رفقائے سفر سے خطاب کرتے ہوئے ضمناً کہا تھا کہ "جب شروع شروع میں طلوع اسلام کی آواز بلند ہوئی تو بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ نقار خانے میں طوطی کی یہ آواز یونہی فضا میں گم ہو کر ضائع جا رہی ہے۔ لیکن اسی ننھی سی آواز کا اثر ہے کہ اس وقت ملک کا کوئی گوشہ نہیں جو اس سے متاثر نہ ہو چکا ہو۔ حتیٰ کہ موافقین تو ایک طرف، مخالفین تک کی یہ حالت ہے کہ وہ اب طلوع اسلام کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر میں اس کے الفاظ اور اصطلاحات بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اس کے پیش کردہ دین کے تصور کو اپنا رہے ہیں، حتیٰ کہ وہ قرآنی آیات کا ترجمہ بھی اسی کے اسلوب و انداز میں پیش کرتے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں کہا تھا کہ

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم رستے پہ زاہد کو
کہ سمجھاتا ہوا اب تا درِ میخانہ آتا ہے

جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے واقعات اس کی شہادت بہم پہنچاتے جا رہے ہیں کہ طلوع اسلام کی آواز کس قدر حق و صداقت کی آواز ہے جس کی ہمنوائی پر اب اس کے بڑے بڑے مخالفین بھی مجبور ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اب متشدد دین کی حالت یہ ہے کہ الفاظ و اصطلاحات اور اسلوب و انداز تو ایک طرف، یہ آہستہ آہستہ قرآن کے ان بنیادی تصورات تک کو اپناتے جا رہے ہیں جنھیں پیش کرنے کی سعادت طلوع اسلام کو حاصل ہوئی اور جن کی بنا پر ان حضرات کی "بارگاہِ علم و تقدس" سے اس کے خلاف الحاد، بے دینی، فتنہ پردازی، اسلام کشی (اور نہ معلوم کس کس انداز کے) فتاوے صادر ہوئے (اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں) دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ مذہب اور دین محترم پرویز صاحب نے اپنی بنیادی تصنیف "اسباب زوال امت" میں پہلی بار اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور ہمارے زوال کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم اس دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں جس کی وجہ سے ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ انھوں نے اس ضمن میں یہ بھی کہا تھا کہ انگریزی زبان میں اسکے لئے جو "ریلیجن" (RELIGION) کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ بھی اسے مذہب ہی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ دین کی حیثیت سے نہیں۔

ان کے اس اظہارِ حقیقت پر ارباب مذہب کی طرف سے تکفیر و تفسیق اور طعن و تشنیع کے جو تیر برسائے گئے فضا اس وقت تک ان سے

مجروح ہے لیکن صداقت کی قوت ملاحظہ کیجئے کہ اب انہی گوشوں سے یہ آواز آرہی ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ اس مخالفت میں سب سے پیش پیش جماعت اسلامی کے ملاء اعلےٰ تھے اب دیکھئے وہ اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ۲۳ جون ۱۹۵۷ء کے روزنامہ نوائے پاکستان میں (مولانا) محمد یعقوب صاحب (خطیب جامع مسجد نہری۔ لائلپور) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "مذہب اور دین" اس میں انہوں نے محترم نعیم صدیقی صاحب کے ایک مضمون کے اقتباسات دیئے ہیں جو ان کے مجلہ چراغ راہ (بابت اپریل ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

> یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب ہے۔ نہ جانے کتنی لاینحل الجھنوں کا موجب بنا چلا آرہا ہے..... مذہب ایک جوہڑ یا تالاب کے کھڑے پانی کی مانند ہے..... مذہب فرد کو اجتماعی نظام سے بالکل الگ کر لیتا ہے اور تمدنی ماحول کو اپنا موضوع فکر اور میدان عمل بنائے بغیر فرد کو تقویٰ سے آراستہ کرنے میں مگن رہتا ہے اور فاسد سے فاسد نظام کے تحت وہ بزعم خویش اسے قابل بنا سکتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے نیکی کے بلند ترین مراتب اور بدی کے غلیظ ترین گڑھے بس فرد کی انفرادی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ مذہب فرد کو تمدنی ہنگاموں سے دور اپنی خانقاہ تزکیہ میں بیٹھنا سکھاتا ہے۔

آپ اس اقتباس کو سامنے رکھئے اور پھر "اسباب زوال امت" کے متعلقہ حصہ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ پورا تصور (اور تقابل) وہیں سے لیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نعیم صاحب کا انداز بیان ٹھیٹھ جماعت اسلامی کا ہے۔

نعیم صاحب سے صرف نظر کیجئے خود صاحب مقالہ (محترم یعقوب صاحب) کو دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ان کے مقالہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> اسلام کے ابتدائی دور میں مذہب کا لفظ مسلک کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ گویا کہ مذہب کا تصور محدود تھا اور دین کا تصور وسیع تھا جیسا کہ مذہب امام ابوحنیفہؒ یا مذہب امام شافعیؒ سے مراد ان بزرگوں کا اپنا اجتہادی فقہی مذہب ہے۔ مگر آہستہ آہستہ مذہب کا لفظ عام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مذہب اور دین ہم معنی اور متحد المفہوم قرار پا گئے..... خواص نے بھی مذہب کو دین کے بجائے استعمال کیا اور عوام نے بھی مذہب اور دین کو ایک چیز سمجھا۔ عربی۔ انگریزی وغیرہ زبانوں میں بھی دین کا معنی مذہب اور مذہب کا معنی دین کیا گیا۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات جو آج تک "مذہب اسلام" "مذہب اسلام" پکارتے چلے آرہے تھے اب کس طرح مذہب کو دین سے الگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں!

۳۔ ذرائع پیداوار

ایک اور مثال لیجئے۔ محترم پرویز صاحب شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن کے معاشی تصور کی رو سے ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے ملت (نظام یا مملکت) کی تحویل میں رہنے چاہئیں

اس تصور کو انھوں نے اپنی گرانقدر تصنیف "نظامِ ربوبیت" میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ محترم موصوف کے اس تصور کو اسلام کی ضد، اور اسے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ (زندیق، ملحد، بے دین) قرار دیا گیا۔ اس جہاد میں جمعیت اہل حدیث دوسروں سے کچھ آگے ہی تھی۔ چنانچہ ان کے ترجمان ہفتہ وار جریدہ الاعتصام نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا جس میں نظامِ ربوبیت اور اس کے پیش کردہ تصور پر مصنف کو گالیاں تک دی گئی تھیں۔

اب انہی حضرات کے نقیب ماہوار مجلہ رحیق کی جون ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں (مولانا) حافظ محب اللہ صاحب ندوی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ

> میرے خیال میں اس بارے میں پہلے گروہ (یعنی قدامت پسند طبقہ) کو بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا کہ بنیادی ضروریات پیدا کرنے والے ذرائع اور عاملین کو کم از کم موجودہ حالت میں کچھ دنوں تک حکومت کے قانونی ہاتھوں میں رہنا چاہیئے جس کی گنجائش کتاب و سنت میں موجود ہے۔

یعنی وہ تصور جس کی بنا پر طلوع کو ملحد و بے دین قرار دیا جاتا تھا اب اس کے متعلق ارشاد ہے کہ "اس کی گنجائش کتاب و سنت میں موجود ہے"۔

۳۔ آل ورلڈ مسلم کانفرنس

ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے کراچی میں موتمر عالم اسلامی کا پہلا اجتماع تھا جس میں پاکستان کے علاوہ تمام مسلم ممالک کے جید علماء و مفکرین شریک تھے۔ سبجیکٹ کمیٹی میں مسئلہ زیر غور یہ تھا کہ ایک مستقل موتمر عالم اسلامی (آل ورلڈ مسلم کانفرنس) تشکیل کی جائے۔ تاکہ وہ اسلامی ممالک کے اجتماعی مسائل کا حل باہمی مشاورت سے تلاش کرے۔ اتفاق سے اس اجلاس میں محترم پرویز صاحب بھی شریک تھے۔ انھوں نے ان حضرات سے کہا کہ جب ہمارے ہاں پہلے سے ایک مستقل موتمر عالم اسلامی موجود ہے جس کا سالانہ اجلاس بالالتزام ہوتا ہے تو پھر ایک نئی موتمر کی تشکیل کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے ان کی مراد حج کا اجتماع تھا۔ لیکن آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ اس کی ہر طرف سے مخالفت ہوئی اور اس کی بڑی دلیل یہ تھی کہ حج ایک عبادت ہے۔ اس میں سیاسی (دنیاوی) امور کس طرح زیر بحث لائے جا سکتے ہیں! (تفصیل اس اجلاس کی مارچ ۱۹۴۹ء کے طلوع اسلام میں درج ہے)

یہ مخالفت تمام اسلامی ممالک کے جید علماء کی طرف سے ہوئی۔ اِسی سال اخبارات میں (حج سے ذرا پہلے) یہ خبر شائع ہوئی کہ

> حاجی عید کے دن تک منیٰ میں قیام کریں گے۔ اس موقع پر اسلامی ممالک کی ایک نمائندہ کانفرنس بھی ہوگی جس میں اسلامی دنیا کے اہم معاملات پر بات چیت ہوگی جن میں کشمیر، الجزائر اور فلسطین کے مسئلے شامل ہوں گے۔

فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

۴۔ قرآنی سیرتِ طیبہ

اور آخر میں ایک اور درخشندہ مثال: محترم پرویز صاحب کا سب سے بڑا جرم یہ قرار دیا جاتا ہے کہ

ان کا مسلک (بلکہ دعوےٰ) یہ ہے کہ

(۱) قرآن اپنی تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں اور

(۲) حضورؐ کا اسوۂ حسنہ قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے جس کی روشنی میں حضورؐ کی پوری کی پوری سیرتِ طیبہ مرتب کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ جہاں انھوں نے شقِ اول کے ثبوت میں (کئی جلدوں میں) معارف القرآن جیسی کتاب شائع کی، شقِ دوم کی تائید میں معراجِ انسانیت کو پیش کیا۔ یہ سیرتِ نبی اکرمؐ پر ایک گرانقدر تصنیف ہے۔ جسے خالصتہً قرآن کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہی ہے ان کا وہ جرم جس کی بناء پر انھیں منکرِ حدیث، منکرِ شانِ رسالت (اور نہ جانے کیا کیا) قرار دیا گیا۔ لیکن یہ دیکھئے کہ اب یہی حضرات اس باب میں کیا مسلک اختیار کر رہے ہیں۔ الاعتصام کی ۵ جولائی ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں (مولانا) ابوعلی الاثری کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سیرتِ نبوی قرآن کی روشنی میں"۔ اس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں کہ

> میں جب کبھی سیرت کی کوئی عمدہ اور مستند کتاب پڑھنے کے لئے اٹھاتا تھا تو معاً یہ خیال آتا تھا کہ کاش سیرت کی کوئی ایسی کتاب بھی ہوتی جو شروع سے آخر تک بجائے روایاتِ تاریخی و مجموعہائے سیر و کتبِ مغازی کے قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہوتی۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ یہی خیال (مولانا) ابوالکلام صاحب آزاد کے پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں صاحبِ مضمون نے جناب آزاد صاحب کی مشہور تصنیف "تذکرہ" کا ایک باب نقل کیا ہے۔ اس میں جناب آزاد رقمطراز ہیں۔

> لوگوں نے حیات و سیرتِ طیبہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاترِ تاریخی سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف قرآن حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی سیرت پر کیسی روشنی پڑتی ہے اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں۔ اسی طرح اپنے حامل و مبلغ کے وجود و حیات کے بیان میں بھی خارج کا محتاج ہے یا نہیں؟

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے (جناب آزاد نے) کس طرح اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کا مطالعہ کیا اور اس سے کس قدر حیران کن نتائج ان کے سامنے آئے۔ انہی کے الفاظ میں سنیئے۔

> لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گذری تھی کہ جس کتاب کو بظاہر جا بجا ذکرِ احکام و مسائل و قصص گزشتگان و رفتگان سے مملو پاتے ہیں، اس میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخصِ رسالت کے حالات و وقائع کا بھی موجود ہوگا کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں اور پھر نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت بلکہ صحابہ کرام کے حالات و خصائص کا بھی کافی ذخیرہ موجود ملا۔ صحابہ کی جماعت درسگاہ تزکیہ و تعلیمِ نبوت

> سے نکلی ہوئی "مومنون الاولون" کی جماعت تھی ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم اس لئے ان کے سوانح ایام بھی سیرت نبویہ ہی کے مختلف اجزاء ہیں، بلکہ ہدایت قرآنی اور حکمت نبوی کے عملی و مجسم ثمرات ہونے کے لحاظ سے لائق و آیات نبوت کے حکم میں داخل۔ پس یقیناً آپ کی سیرت مکمل نہ ہوتی اگر ان کے حالات بھی قرآن میں پوری شرح و تفصیل سے نہ ملتے۔ اس ٹکڑے کو دیکھ کر مجھ کو آخری مرتبہ یقین اس بارے میں حاصل ہو گیا کہ اگر دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہو جائیں اور دنیا نے جو کچھ چھٹی صدی عیسوی کے ایک ظہور دعوت کی بابت سنا ہے وہ سب کچھ بھلا دے اور صرف قرآن ہی دنیا میں رہے جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مقدسہ اور آپ کی سیرت و حیات کے براہین و شواہد مٹ نہیں سکتے

جناب آزاد کی یہ تصنیف آج تک شرمندۂ اشاعت نہیں ہوئی اور ان کے معتقدین (اہل حدیث حضرات) کو اب تک اس کا انتظار اور تلاش ہے۔ لیکن کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ جس شخص نے ایسے عظیم تصور کو عملی پیکر میں منتقل کر کے "قرآنی سیرت طیبہ پر معراج انسانیت" جیسی کتاب شائع کر دی اسے یہی حضرات "منکر شان رسالت" قرار دے رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ مولانا لکھ کر ان کے گروہ میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا۔

جناب آزاد نے اس مقام پر یہ بھی کہا ہے کہ "قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج نہیں" اس حقیقت کی وضاحت انہوں نے 'ترجمان القرآن' میں ان الفاظ سے کی ہے۔

> اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل اور نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں سے خارجی اثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیئے پھر آگے بڑھیں، اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔ (جلد ۱۔ صفحہ ۱)

یہی وہ بنیادی اصول جس کی رو سے محترم پرویز صاحب قرآن کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں، اور اسی کی بناء پر انہیں منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا تھا کہ ہماری تاریخ میں بہت سی باتیں ایسی شامل کر دی گئی ہیں جن سے حقیقت مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور جو حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت کو (معاذ اللہ) داغدار کر دیتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو قرآن کی روشنی میں از سر نو مرتب کریں اور اس میں سے اس قسم کے تمام عناصر الگ کر دیں لیکن اگر ہماری قدامت پرستی اس کی اجازت نہ دے تو بہتر یہی ہو کہ اس تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش نہ کیا جائے بلکہ قرآن کو پیش کیا جائے جس میں دین کے حقائق اور حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اتنا کہنا تھا کہ ملک میں ایک طوفان مچا دیا گیا کہ یہ شخص ہمارے اسلاف کے کارناموں کو دریا برد کرنے پر تلا بیٹھا ہے لیکن یہ دیکھئے کہ یہی کچھ جناب آزاد فرماتے ہیں اور ان کا حلقہ اسے فخر سے شائع کر رہا ہے۔

ہم نے یہ مثالیں کسی الزام اور جذبے کے ماتحت پیش نہیں کیں، بلکہ ایک تو بطور تحدیث نعمت پیش کی ہیں کہ مبداء فیض کی کرم گستری سے یہ سعادت طلوع اسلام کے حصہ میں آئی کہ اس نے قرآن کریم کے ان مستور حقائق کو اس درخشندگی اور تابناکی سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور دوسرے یہ بتانے کیلئے کہ زمانے کے تقاضے کس طرح ہمارے قدامت پرست طبقہ کو کشاں کشاں قرآن کی طرف لا رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جب ان مخالفین کا اڑایا ہوا گرد و غبار بیٹھ جائے گا تو اس کے بعد قرآن کے وہ حقائق باقی رہ جائیں گے جو طلوع اسلام کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں کہ دنیا میں بقا صرف قرآنی حقائق کے لئے ہے باقی سب جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے جن میں چمک تو بہت ہوتی ہے لیکن وہ زمانہ کی کسوٹی پر کبھی پورے نہیں اتر سکتے۔

باب المراسلات

شیعہ حضرات کی نماز

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ

طلوع اسلام کے جون کے پرچہ میں آپکے ایک مکتوب نگار نے یہ بتایا ہے کہ اہل حدیث اور حنفی حضرات کے ہاں تراویح اور عید کی نمازیں کتنے اختلافات ہیں اور ہر فریق اپنے اپنے عمل کو تواتر سے صحیح ثابت کرتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک حنفی فرقہ سے کہیں زیادہ اہم فرقہ شیعہ ہے اس لئے کہ حنفی تو پھر بھی بعد میں پیدا ہوئے تھے۔ شیعہ خلافت راشدہ کے زمانے میں موجود تھے۔ اس لئے جس نماز کو شیعہ حضرات اپنا عمل متواتر قرار دیتے ہیں، اس کا زمانہ رسول اللہ صلعم کے زمانے سے متصل ہے۔ دوسری طرف اہل سنت والجماعت حضرات کا دعویٰ ہے کہ انکی نماز بھی تواتر سے عہد رسالت آب صلعم اور عہد خلافت راشدہ تک پہنچتی ہے۔ اب آپ ذرا شیعہ حضرات کی نماز کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا یہ نماز رسول اللہ صلعم کی نماز ہے یا کسی حضرات کی نماز۔

(۱) شیعہ حضرات کے ہاں نماز صرف فرضوں کی رکعات کا نام ہے۔ نیز وہ بجز زمین یا نباتات کے جو زمین سے اگے اور کسی چیز پر سجدہ جائز نہیں سمجھتے

(۲) ان کے ہاں غالباً امام کی غیبت کی وجہ سے نماز انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اذان دینا ضروری ہے اور اذان میں اشہد ان محمداً رسول اللہ کے بعد اشہد ان امیر المومنین وامام المتقین علیاً ولی اللہ ووصی رسول اللہ وخلیفۃ بلا فصل بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حی علی الفلاح کے بعد حی علی خیر العمل بھی دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ اذان کے بعد نمازی خود ہی اقامت کہتا ہے۔

(۳) نماز شروع کرنے کے لئے سات تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ اس طرح کہ اول تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر کانوں تک ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر یہ دعا پڑھی جاتی ہے اللّٰھم انت الملک الحق المبین لا الٰہ الا انت سبحانک وبحمدک انی ظلمت نفسی فاغفرلی ذنبی انہ لا یغفر الذنوب الا انت۔ اس کے بعد نمازی پھر اسی طرح دو مرتبہ اللہ اکبر کہے اور یہ دعا پڑھے اللھم لبیک وسعدیک والخیر فی یدیک والشر لیس الیک والمھدی من ھدیت عبدک وابن عبدیک ذلیل بین یدیک لا ملجأ الا الیک ولا مھرب منک الا الیک سبحٰنک وحنانیک تبارکت وتعالیت سبحٰنک ربنا ورب البیت الحرام۔ پھر ایک مرتبہ اللہ اکبر کہے اور رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ والی دعا پڑھے۔ یہ ہو گئیں سات تکبیریں۔ پھر تکبیر تحریمہ کہے اور یہ دعا پڑھے وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض۔

قیام میں دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے۔ سورۃ فاتحہ اور ایک سورت کے بعد ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے

دوسری رکعت میں الحمد اور سورت کے بعد کذالک اللہ ربی تین بار کہے۔ پھر ہاتھوں کو دعا کے لئے اپنے منہ کے برابر اٹھائے اور یہ دعا پڑھے اللھم اغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا فی الدنیا والاخرۃ انک علی کل شیئ قدیر پھر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت پوری کرے۔ اگر نماز دو رکعتی ہے تو پہلے تشہد پڑھے یعنی اشھد ان لا الہ ..... عبدہ ورسولہ اس کے بعد اللھم صل علی محمد وآل محمد پڑھے اور پھر سلام کہے السلام علیک ایھا النبی ..... یہ پہلا سلام ہے۔ پھر دوسرا سلام جانب قبلہ کہے اور گوشہ چشم سے دائیں طرف اشارہ کرے۔

اور اگر نماز تین یا چار رکعت کی ہو تو تیسری رکعت میں الحمد کے بعد تین بار یہ تسبیح پڑھے۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ استغفر اللہ اس طرح رکعتیں پوری کر کے تشہد اور سلام کے بعد تین بار اللہ اکبر کہے اس سے نماز ختم ہو جائیگی۔

واضح رہے کہ اگرچہ نماز اکیلے اکیلے پڑھی جاتی ہے لیکن قرأت باواز بلند ہوتی ہے۔

جہاں تک اوقات صلوۃ کا تعلق ہے ظہر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جبکہ غروب آفتاب میں پانچ رکعتوں کا وقت باقی ہے یعنی چار رکعتیں ظہر کی پڑھ لی جائیں اور ایک رکعت عصر کی۔ عصر کی باقی تین رکعتیں غروب آفتاب کے بعد بھی پڑھ لی جائیں تو جائز ہے اسی طرح مغرب وعشا کا وقت نصف شب تک ہے بشرطیکہ نصف شب میں چار رکعتوں کا وقت باقی ہے۔ یعنی تین مغرب کی اور ایک رکعت عشا کی پڑھی جا سکے۔ عشا کی باقی تین رکعتیں نصف شب کے بعد بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔

فرضوں کے علاوہ نماز نافلہ میں نماز ظہر سے پہلے آٹھ رکعتیں اور عصر سے پہلے آٹھ رکعتیں پڑھی جائیں۔

جمعہ کی نماز بوجہ غیبت امام علیہ السلام کے ساقط ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک نماز جمعہ کو نماز ظہر کے بدلے ادا کیا جا سکتا ہے اس میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھا کر یہ پڑھنا چاہیئے اللھم ان عبید امن عبادک الصالحین تاموا بکتابک وسنۃ نبیک فاجزھم عنا خیر الجزاء۔ اسی طرح دوسری رکعت میں پڑھنا چاہیئے۔

بعض کے نزدیک جمعہ کی نماز میں اول رکعت میں ایک مرتبہ الحمد اور سات مرتبہ قل ھو اللہ اور دوسری رکعت میں الحمد کے بعد سات مرتبہ معوذتین پڑھی جائیں۔ سلام کے بعد سات مرتبہ آیۃ الکرسی۔ اسی طرح آٹھ رکعتیں پوری کی جائیں۔

ان نمازوں کے علاوہ ہر مہینہ کی مختلف تاریخوں میں اور بھی کئی نمازیں آتی ہیں جن میں یوم نوروز کی نماز خاص اہمیت رکھتی ہے

آپ اگر دیکھنا چاہیں کہ شیعہ حضرات کی نمازیں اور سنی حضرات کی نمازیں کتنا فرق ہے تو آپ کسی صاحب سے کہیں کہ وہ اوپر کے طریقہ کے مطابق نماز کی دو رکعتیں پوری کرے۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ اس نماز میں اور اس نماز میں جو آپ پڑھتے ہیں کتنا فرق ہے اب سوال یہ ہے کہ آیا رسول اللہ صلعم اس طرح سے نماز پڑھتے تھے جس طرح شیعہ حضرات پڑھتے ہیں۔ یا اس طرح جس طرح سنی حضرات پڑھتے ہیں۔ دعوی دونوں کا یہی ہے کہ رسول اللہ ان کی سی نماز پڑھتے تھے۔ اور دونوں نمازیں مسلمانوں میں متواتر چلی آ رہی ہیں۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ ہمارے مختلف فرقے مختلف طور پر نماز پڑھتے ہیں اور کوئی دوسرے کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ اس نے ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رکھی ہے۔ اس کی نماز کو بھی وہی نماز سمجھا جاتا ہے جسے اللہ نے فرض قرار دیا ہے۔ یہ تمام حضرات ان مختلف نمازوں کو گوارہ کرتے

ہیں لیکن اگر آج کوئی شخص نماز میں کوئی ایسی حرکت کرے جو ان فرقوں میں سے کسی کے ہاں نہ پائی جاتی ہو تو اسے یہ حضرات الحاد اور بے دینی اور فتنہ قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر وہ اختلاف جس سے ہمارے مولوی صاحبان مانوس ہو چکے ہیں عین دین ہے لیکن کوئی ایسی بات جس سے یہ مانوس نہیں وہ فتنہ ہے۔ مثلاً حنفی بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں اور اہل حدیث آٹھ رکعت۔ شیعہ حضرات پڑھتے ہی نہیں۔ اگر آٹھ رکعت پہلے سے نہ چلی آتیں اور کوئی شخص آج آٹھ رکعت تراویح شروع کر دیتا تو آپ دیکھتے کہ حنفی حضرات اسے کس طرح دین میں فتنہ قرار دیدیتے۔ لیکن اب حضرات اسے فتنہ نہیں کہتے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک ہی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ہر گروہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

طلوع اسلام کا مسلک بالکل صحیح نظر آتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی بنیادوں پر خلافت علی منہاج النبوت قائم ہو جائے تو پھر یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ اس کے سوا امت کی وحدت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ اسلام اور فرقہ بندی ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس لئے اسلام وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں امت میں وحدت ہو۔ اگر آپ مجھے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کے خلاف جانے والا نہ قرار دیں تو میرے خیال میں امت واحدہ والا اسلام تو شاید کسی ایسی قوم ہی میں قائم ہو سکے جو صرف قرآن کی بنیادوں پر اسلام لائے۔ ورنہ یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ہمارے موجودہ فرقے یہ اختلافات چھوڑ دیں۔ ہاں خلافت کے قیام کی بات اور ہے۔

طلوع اسلام

یہ خط بیشتر معلومات پر مبنی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی بنیادوں پر جہاں بھی خلافت علی منہاج النبوت قائم ہو گئی وہاں اختلافات مٹ جائیں گے۔ ایسی خلافت کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مولوی صاحبان ہیں جن میں سے کوئی بھی اپنے فرقہ کی نسبت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو صرف مسلمان کہنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر داعی الی القرآن کو ملحد اور بے دین اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔

قرآنی فیصلے

روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔

ضخامت ۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے!

[ہم نے اکتوبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں جریدہ ڈان کے حوالے سے ایک مقالہ درج کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ مجلس اقوام غلامی کے انسداد کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے۔ اور اسلامی مملکتیں (بالخصوص مملکت حجاز) اس کی ترویج میں کس طرح نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔

پھر ہم نے مئی ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں لندن کے ہفتہ وار اخبار "دی نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے حوالے سے لکھا تھا کہ اسلامی ممالک میں غلام اور لونڈیوں کی تجارت کس منظم طریق سے ہو رہی ہے۔

اب ہمارے سامنے لندن کا ماہوار مجلہ "انگلش ڈائجسٹ" (بابت مئی ۱۹۵۷ء) ہے جس میں مسٹر جون لیفن (JOHN LAFFIN) نے عرب ممالک میں غلام اور لونڈیوں کے متعلق مزید شواہد و کوائف بہم پہنچائے ہیں۔ اس مقالہ کا آزاد ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ہم غلام اور لونڈیوں کے متعلق یہ تمام کوائف اس لئے نہیں درج کرتے کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ سلاطین کے حریم خانوں میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ ملوکیت جہاں بھی ہو گی وہ اسی قسم کے کوائف پیش کرے گی۔ ہم انہیں اس لئے بار بار سامنے لاتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارا وہ "مذہب" جو شاہی درباروں میں وضع ہوا تھا وہ کس کس قسم کے انسانیت سوز جرائم کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے اور ان فتاویٰ کی آڑ میں ہماری مقدس سرزمینوں میں کس دھڑلے سے ان شرمناک جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ مذہب جسے ہمارے ارباب شریعت دینِ حقہ کے نام سے دنیا میں پیش کرتے ہیں اور جو قلب حساس اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں انہیں کس طرح جہنم رسید کرتے ہیں۔ طلوع اسلام]

جب تک میں اس حقیقت سے ناواقف تھا، حرم سے متعلق تفاصیل کو تفریح طبع کے لئے سن کر خوب ہنستا تھا۔ لیکن اب میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ حرم، وہ قید خانے ہیں جن میں انسانیت پر انتہائی مظالم توڑے جاتے ہیں۔ جہاں کی آبادی انسانوں کی عزت و آزادی لوٹنے والوں کی مخلوق کا نتیجہ ہے اور ان کی زندگی کا مقصد عربی شیوخ اور تیل کے مالکوں کی ذلیل نفسانی خواہشات پوری کرنا ہے۔

میں نے ایک سعودی حرم کو اندر سے جھانک کر دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا وہ بڑا عبرت آمیز تھا۔ وہاں کے نازنین خوشنما پرندوں کی طرح تھے اور

اکثر کمروں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں وہاں "نظارہ حسن" نہ کر سکا کیونکہ رات کے وقت وہاں جانے کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ پھر بھی جو کچھ دیکھا اور سنا وہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی تھا کہ پس پردہ انتہائی اذیت کوش مظالم کی طویل داستانیں برابر دہرائی جاتی ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مالکان حرم ۲۳ سال سے زائد عمر کی عورتوں کو نہیں خریدتے کیونکہ اس عمر کے بعد اس خصوصی زندگی کے لئے زیادہ عرصہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے انھیں ٹریننگ دینے پر جو کچھ صرف آتا ہے اس کا معاوضہ اچھا نہیں ملتا۔ مکہ کے قریب ان غلاموں کے لئے ایک تربیت گاہ قائم کی گئی ہے۔ اس کی مالکہ ایک آرمینی عورت ہے جو مضبوط جسم کے باوجود انسانی احساسات و جذبات سے بالکل عاری معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ درندہ صفت عورت خوشبویات کی تاجر ہے حالانکہ جو کام وہ کرتی ہے وہ نہایت تعفن آمیز ہے۔

یہ آرمینی خاتون ان بدنصیب لڑکیوں کو جو اس تربیتی مرکز میں لائی جاتی ہیں ان کی آنیوالی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہے وہ انھیں بتاتی ہے کہ آنیوالے زمانے میں انھیں اکثر وحشیانہ ہنٹروں کی مار برداشت کرنی پڑے گی لہذا انھیں ان مصائب کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ اور پھر جب وہ اس تربیتی مرکز میں اپنے برہنہ بدن پر آہ و فریاد کے بغیر کوڑوں کی چوٹ برداشت کرنے کے قابل ہوجاتی ہیں۔ اس وقت انھیں حرم کی زندگی گذار لینے کا اہل سمجھا جاتا ہے ایسا نہ کیا جائے تو ان لونڈیوں کی زندگی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس لئے کہ آقا کی ناراضگی کی سزا موت ہوتی ہے۔ بعض حرموں میں تین تین سو جوان اور خوبصورت عورتیں ہوتی ہیں۔ ان کے مالکوں کے سامنے دولت بے حقیقت شے ہے تیل کے چشموں سے انھیں بے شمار دولت مل جاتی ہے اور بظاہر ایسے آثار نہیں کہ دولت کے یہ ذرائع ختم ہوجائیں۔ (نہ تیل کے چشمے سوکھیں نہ حرم کی رونق کم ہو)۔

وہ لوگ جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ عرصہ دراز سے غلامی ختم ہوچکی ہے بڑے تعجب سے پوچھتے ہیں کہ غلام آتے کہاں سے ہیں؟ انھیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیئے کہ غلاموں کی اکثریت صحرائے اعظم کے کنارے بسنے والوں کے علاوہ مراکش، الجزائر اور جھیل چاڈ کے علاقوں سے برآمد کی جاتی ہے جو مشرقی افریقہ میں واقع ہے۔ باشندگان عرب خود اس تجارت کے ابتدائی مراحل سے دور رہتے ہیں اور یہ کام عام طور پر تجربہ کار بردہ فروشوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جن میں اس وقت سب سے زیادہ بدنام ایک سابق جرمن جرنل (DIETERLE) ہے جو ہٹلر کے افریقی عسکری کمیٹی میں کپتان تھا۔ اس کا تجارتی مرکز (TIBESTE) ہے جسے ایک قلعہ سمجھئے۔ (DIETERLE) کے کارندے صحرا کے ہر چہار جانب سے غلاموں کو جمع کرکے اس کے تجارتی مرکز پر پہنچاتے ہیں۔ جہاں سے وہ بذریعہ سمندری جہاز منزل مقصود کی جانب روانہ کئے جاتے ہیں۔ ایک فرانسیسی صحافی (MARAY) جس کی وقائع نویسی ہنوز ناقابل تردید ہے لکھتا ہے کہ اس مرکز تجارت کی جانب پیدل روانہ ہونے والے ہر پانچ قیدیوں میں سے بمشکل ایک یعنی جو تھائی وہاں تک پہنچ پاتے ہیں۔ دن کی گرمی اور رات کی سردی کی شدت پھر پیاس اور بھوک۔ ان سب کا مقابلہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کہاں تک کر سکتے ہیں؟

عرب میں تقریباً ۲۵ ہزار افراد غلام رکھنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ ان کے نمائندے اُن غلاموں کو خریدتے ہیں جو زندہ بچ کر (TIBESTE) تک پہنچ جاتے ہیں۔ غلاموں کی قیمت ان کی صحت، تندرستی اور ظاہری حسن کے اعتبار سے مقرر کی جاتی ہے ایک صحت مند اور حسین لڑکی پانچ ہزار ڈالر میں، اور ایک جوان مرد پچاس ڈالر میں مل سکتا ہے تیل کی رقم وصول نہ ہونے کی صورت میں (DIETERLE) کے کارندے

عرب خریداروں سے بندوق اور کارتوس بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اس تجارت میں کھارا صرف عرب شہزادوں کے نام ہی کھل سکتا ہے ورنہ ساری خرید و فروخت نقد ہوتی ہے۔

(TIBESTE) سے غلاموں کو خلیج احمر کی جانب تقریباً دو ہزار میل کے فاصلہ پر بھیجا جاتا ہے اور جب تک وہ سرزمین عرب تک پہونچ نہ جائیں ساری ذمہ داری DIETERLE کی ہوتی ہے۔ اس وسیع اور عریض سرزمین میں DIETERLE کو عموماً محتسب دستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے کہ اس کا اپنا محکمہ سراغرسانی بہت مکمل ہے اور اسے ہر آنیوالے خطرے کی اطلاع وقت سے پہلے ہی مل جاتی ہے جہاز پر غلاموں کو بڑے بڑے پتھروں اور لوہے کے ٹکڑوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور اس طرح جب کوئی برطانوی بحری کشتی اس جہاز کی تلاشی لینے کی کوشش کرتی ہے تو ان بے بس غلاموں کو جہاز کی دوسری سمت سے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ جہاز محفوظ رہ سکے۔ کیونکہ بین الاقوامی قوانین کے ماتحت کسی قانونی کارروائی کے لئے جہاز میں غلاموں کی موجودگی ضروری ہے ایسی صورت میں غوطہ خوروں کے لئے لوہے اور پتھروں سے بندھے ہوئے مردہ جسموں کو سمندر کی تہہ میں تلاش کرنا بے سود ہوتا ہے۔

عرب کے تقریباً ہر شہر کی اپنی علیحدہ غلاموں کی منڈی ہے۔ بازاروں میں غلاموں اور لونڈیوں کو ..... ننگا کھڑا کیا جاتا ہے تاکہ خریداروں کو یقین ہو سکے کہ مال بے داغ ہے۔ خریداروں کو اجازت ہے کہ دوسری اجناسِ تجارت کی طرح ان غلام اور لونڈیوں کے جسموں کو ہر طرح سے ٹٹول کر دیکھ لیں۔ گھوڑوں کی طرح ان غلاموں کو دانت دکھلانے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے تاکہ ان کی عمر کا اندازہ ہو سکے۔ گذشتہ دنوں میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض عورتیں اپنے دانتوں میں سیاہی مل لیتی تھیں تاکہ عمر میں زیادہ معلوم ہوں۔ اب ایک آدمی ان عورتوں کے قریب پردوں میں بھیگا کپڑا لئے کھڑا رہتا ہے تاکہ خریدار کی مرضی کے مطابق پردوں سے دانتوں کو صاف کر کے عمر کی حقیقت واضح کر دے۔

اپنے خیال کے مطابق اکثر غلام بھاگ نکلنے کی مختلف کوششیں کرتے ہیں لیکن بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اب ان ممالک میں نوجوان لڑکیوں کی طرح تندرست اور جوان مردوں کی بھی بہت مانگ ہے۔ کیونکہ دولت مند سعودیوں کے شکار اور چائے کے کھیتوں اور کنوؤں پر کام کرنے اور نہریں کھودنے کے لئے ان کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نوجوان اپنے آقاؤں کے لئے عالیشان محل کی تعمیر اور ان کے دلفریب باغات کی تزئین میں بھی بہت کام آتے ہیں۔

ایک انتہائی حیرت انگیز بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ بعض غلام عورتیں حقیقی معنوں میں سفید فام ہوتی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہاں سے حاصل کی جاتی ہیں اور کہاں جذب ہو جاتی ہیں۔ فروخت ہوتے ہی انھیں ان کے آقاؤں کے حرم کی جانب بڑے اہتمام اور سرعت سے بھیجا جاتا ہے۔ چونکہ ان کی تعداد کم ہے لہٰذا قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل کی ایک رپورٹ کے مطابق ان سفید فام عورتوں کی آمد کا ایک راستہ ہانگ کانگ ہے لیکن مجھے قاہرہ اور پھر بیروت میں یہ معلوم ہوا کہ انھیں فرانس اور جرمنی سے بھی لایا جاتا ہے۔

صحراؤں سے گھرے ہوئے حرم جیل خانوں سے بھی زیادہ سنگین قید خانے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکی یہاں سے بھاگ نکلے تو اسے اپنے خطرناک عرب آقا سے بھی زیادہ وحشتناک مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے سینکڑوں میل تپتی ریت میں بلا دانہ پانی چلنا پڑتا ہے۔ اگر قریب

کہیں کوئی سڑک ہو تو بھی وہ اس پر چلنے کی ہمت نہیں کر سکتی کیونکہ اس حالت میں کوئی بھی عرب اسے گرفتار کر کے اس کے آقا کے پاس واپس لے جا کر انعام حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی لونڈی کے فرار ہونے میں اس کی امداد کرے تو اسے اس کی سزا مل سکتی ہے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ تیل کے چشموں سے متعلق آنے والے امریکیوں نے غلام مردوں اور عورتوں کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مدد کی ہے۔ لیکن ایسا کرنا ان کے لئے بہرحال خطرناک ہے۔ تیل کمپنیوں نے سخت احکام جاری کر دیئے ہیں کہ ان کا کوئی ملازم اس نوعیت کی انسانی ہمدردی کا اظہار نہ کرے اس لئے کہ انھیں تیل کے مالک عرب شہزادوں کی ناراضگی کا خوف ہے۔

کوئی تین سال پہلے کی بات ہے کہ ایک نوجوان امریکی انجینیر نے ایک گندمی رنگ کی دوشیزہ کو دیکھا جو کویت کے ایک شیخ کے ساتھ تھی۔ یہ عرب ادھیڑ عمر کا تھا اور اس کے چہرے سے ہوسناکی برستی تھی۔ یہ دیکھ کر اس امریکی کو یقین ہو گیا کہ وہ لڑکی اس بدنما شیخ سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ اس امریکی نے سمجھے بوجھے بغیر اس لڑکی کو ایک خط لکھ دیا جو شیخ کے جاسوسوں کے ہاتھ پڑ گیا نتیجہ اس کا یہ کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس امریکی کو اپنے وطن واپس جانا پڑا۔

گذشتہ سال ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک ریگستان میں دو حبشیوں کے ساتھ ایک امریکی کی لاش ملی جو تیل کے پائپ لائن کی نگہبانی کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ واقعہ کیا تھا لیکن اس کے متعلق کوئی بات کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا۔ عام انسانوں کی طرح اکثر امریکی بھی رحم دل ہوتے ہیں۔ ہوا یہ کہ جب اس بدنصیب امریکی نے ان دو حبشیوں کو پائپ لائن کے کنارے کنارے آزادی حاصل کرنے کے لئے فرار ہوتے دیکھا تو چاہا کہ وہ ان کی کچھ مدد کرے۔ اس نے سوچا ان دونوں کو اپنی جیپ میں بٹھا کر حفاظت کے ساتھ کسی ساحلی مقام پر پہنچا دے۔ سوئے اتفاق کہ مقامی عرب حاکم کے نگہبان سپاہیوں کو اس کا علم ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے ان دونوں حبشیوں کو مع امریکی کے پکڑا اور دور دراز بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ دیئے۔ اور چلتے چلتے یہ بھی کہہ دیا کہ دیکھو ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اب ہم تمہیں چھوڑے جا رہے ہیں۔ تمہارے سامنے سمندر کا راستہ کھلا ہے جہاں جی چاہے جاؤ۔ انھوں نے یہ کہا اور اونٹوں پر سوار ہو کر واپس چلے گئے۔ سامان خورد و نوش کی عدم موجودگی اور اس پر دن کی شدید گرمی اور رات کی شدید سردی۔ نتیجہ یہ کہ وہ تینوں بمشکل دو دن زندہ رہ سکے۔

ہر سال بہت سے مسلمان دنیا کے مختلف ممالک سے مکہ کی جانب آتے ہیں۔ ان کے ساتھ ملازمین بھی ہوتے ہیں جنھیں فروخت کر کے وہ اپنے سفر کے اخراجات پورے کرتے ہیں یہ خیال بہت اچھا ہے۔ مسلمان تزکیہ نفس کے لئے مکہ جاتے ہیں۔ لہٰذا نقد کی صورت میں زیادہ دولت اپنے ساتھ نہیں لاتے۔ یہ نوکر انھیں چیک کا کام دیتے ہیں۔ جہاں چاہا بھنا لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ غلاموں کو فروخت کر کے حاصل کردہ رقم چھپائی جا سکتی ہے۔ تاکہ ٹیکس سے محفوظ رہ سکے۔ واپسی پر اگر کبھی ان نوکروں یا غلاموں کے رشتہ دار ان کے بارے میں کچھ پوچھیں تو وہ آقا ایک آہ سرد بھر کر کہہ دیتا ہے کہ اس کے وفادار ملازم راستہ میں کسی متعدی مرض کا شکار ہو گئے۔

آجکل کچھ مشرقی جاسوس ان علاقوں میں خفیہ حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ تاکہ وہ مجلس اقوام متحدہ کے لئے اس امر کی شہادت فراہم کر سکیں کہ ان علاقوں میں غلاموں کی تجارت کس طرح ہوتی ہے۔ ان کا یہ کھیل بڑا خطرناک ہے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ سب جاسوس زندہ و سلامت واپس آ کر دنیا کے سامنے اپنی روئیداد پیش کریں گے تو ان درپردہ حالات کا انکشاف اور تو اور خود

عرب شیوخ کے لئے بھی بڑا حیرت انگیز ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اب تک مطمئن ہیں کہ باہر کی دنیا کو ان کی ان حرکات کا کچھ علم نہیں۔

طلوع اسلام یہ ہیں مختصراً ہماری ارض حرم کے کوائف جن کے خلاف کسی ملا کی زبان سے آپ ایک حرف بھی نہیں سنیں گے۔ ان کے خلاف کچھ سننا کجا۔ وہ ان سلاطین کے حق میں ایدہ اللہ بنصرہ کی دعائیں مانگتے اور انہیں حامی السنت والدین قرار دیتے دکھائی دیں گے۔

اے محمد گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برار و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

قرآنی معاشرہ (صفحہ ۳۹ سے آگے)

لہٰذا کسی خدمت کے لئے جب ہم کسی کو منتخب کرنے لگیں تو ہمیں ان خصوصیات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ یہی خصوصیات دراصل معیار انتخاب ہیں۔ آج ہماری سرکاری مشینری کی ناکارکردگی کا جو ہر طرف رونا رویا جارہا ہے اس کی وجہ بھی ہے کہ لوگوں کا انتخاب صحیح معیار کے مطابق نہیں کیا جاتا۔ بلکہ قرابت داری، اقربا پروری، اعزاء نوازی یا صوبائی کوٹہ سسٹم کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ایک قرآنی معاشرے میں ان باتوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ قرآنی معاشرہ میں قابلیت کا معیار انسان کی اپنی صلاحیت اور اہلیت ہوگی۔ نسبی یا وطنی نسبتیں نہیں ہونگی۔

طاہرہ کے نام خطوط

طاہرہ ملت اسلامیہ کی ایک نیک طبیعت اور ذہین بچی ہے جو ہمارے معاشرے میں عورتوں کی پریشان حالی سے بہت متاثر اور ان مشکلات کا حل معلوم کرنے کے لئے بیحد مضطرب ہے۔ اس کے مختلف استفسارات کا جواب قرآن کی روشنی میں خطوط کی صورت میں دیا گیا ہے۔ کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ حصہ اول مجلد قیمت دو روپے۔ حصہ دوم مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی ۲۹

ایک "مغضوبِ علیہ" قوم کے کارنامے

علامہ اقبال نے (مثنوی رموزِ بیخودی میں لکھا تھا)۔

عبرتے از مسلمِ روشن ضمیر — از مآلِ امتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

اس میں یہودیوں کی اس ذلت و مسکنت اور آوارگی و بے وطنی کی طرف اشارہ تھا جو دو ہزار سال سے ہر چشمِ بینا کے لئے سرمایۂ ہزار عبرت بن رہی تھی۔ انہی آوارہ وطن یہودیوں نے آج سے قریب بارہ سال پہلے (۱۹۴۵ء میں) فلسطین میں اپنے قدم جمائے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی پوزیشن حاصل کرلی جسے گردوپیش کی مسلم (عرب) سلطنتوں کی مسلسل جد و جہد کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ اس مدتِ قلیل میں یہودیوں نے فلسطین میں کیا کچھ کر ڈالا ہے؟ اس کا اندازہ اس چھوٹے سے پمفلٹ سے لگ سکتا ہے جو مس کرو (MISS SJBIL EJRE CROWE) کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو بی بی سی (لندن) سے فروری ۱۹۵۶ء میں نشر ہوئی تھی اور جسے حال ہی میں سفارت خانۂ عراق (لندن) نے شائع کیا ہے۔ ہم اس پمفلٹ کے چیدہ چیدہ اعداد و شمار شائع کرتے ہیں، بدیں غرض کہ ہم دیکھیں کہ جو قوم دو ہزار برس تک دنیا میں مارے مارے پھرتی تھی جب اس نے ایک نظم و ضبط کے ماتحت اپنے تمکن اور استحکام کے لئے کمر باندھ لی تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس پمفلٹ میں لکھا ہے۔

(۱) یہودیوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ارضِ فلسطین کا کل ۵½ فیصد رقبہ قیمتاً خریدا تھا۔ اس کے بعد (۱۹۴۸ء میں) مجلس اقوامِ متحدہ نے انہیں ۵۵ فیصد رقبہ عطا کردیا لیکن اب وہ اس ملک کے اسّی فیصد رقبہ پر قابض ہیں یعنی دس ہزار مربع میل رقبہ میں سے آٹھ ہزار مربع میل یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔

(۲) انھوں نے فلسطین کا تمام زرخیز علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ نارنج اور ترنج کے باغات کے وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ تمام ساحلی علاقے ان کی ملکیت میں ہیں۔ ماڈرن یروشلم کا سارا علاقہ ان کے پاس ہے۔ وہاں کی آب رسانی کا سلسلہ ان کی تحویل میں ہے۔ علاوہ ازیں شمالی علاقوں میں جس قدر زائد پانی میسر آسکتا ہے وہ سب کا سب یہودیوں کے پاس چلا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے غیر آباد رقبہ کو سیراب کرسکیں۔

(۳) ان کے پاس ایک بندرگاہ بحیرۂ روم پر ہے اور ایک بندرگاہ بحیرۂ احمر پر۔ اس کے علاوہ حیفہ ریلوے پر کلیتہً کنٹرول انہی کا ہے۔

(۴) ۱۹۴۷ء میں ان کی آبادی قریب پندرہ لاکھ تھی۔ اب یہ سترہ اٹھارہ لاکھ کے درمیان ہے۔ وہ اب تک قریب ساڑھے سات لاکھ مہاجرین کو اپنے ہاں آباد کرچکے ہیں۔

(۵) ان کے عزائم یہ ہیں کہ ۱۹۶۰ء تک قریب پانچ لاکھ ایکڑ زمین زیرِ کاشت لے آئیں اور اپنی آبادی کو بڑھا کر بیس لاکھ تک پہنچا دیں۔

واضح ہے کہ شمالی افریقہ سے آنے والے ایک یہودی مہاجر کے بسانے پر قریباً چار سو پونڈ صرف آتے ہیں۔ یہودی ان تمام مہاجرین کا خرچ برداشت

کرنے کے لئے تیار ہیں۔

(۶) ان اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے یہودیوں کو دسمبر ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک (قریباً ستر کروڑ پونڈ کی امداد باہر سے ملی ہے۔ اس میں سے قریب بیس کروڑ بیرونی یہودیوں نے دیا ہے۔ بیس کروڑ جرمنی سے معاوضہ کے طور پر ملا ہے اور قریباً ساڑھے دس کروڑ امریکہ سے۔

آئندہ پانچ سال میں انہیں ستاون کروڑ پونڈ مل جانے کی توقع ہے۔ اس میں سے چودہ کروڑ جرمن معاوضے سے ملیگا۔ قریب چھ کروڑ امریکہ سے قریب ساڑھے چھ کروڑ فلسطینی یہودی ملک کی ترقی میں سرمایہ کے طور پر لگائیں گے۔ اور بقایا رقم بیرونی یہودی فراہم کریں گے۔

یہ ہے ایک ہلکا سا جائزہ اس ترقی کا جو اس 'ایں سو ماندہ دا ں سو ماندہ' قوم نے قریب بارہ سال کے عرصہ میں کی ہے۔ یہ وہ قوم ہے جس کے متعلق مسلمان اس زعم باطل میں ہے کہ انہیں قیامت تک کہیں حکومت نصیب نہیں ہو سکتی (قرآن کی رو سے یہ خیال کس طرح غلط تھا، اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے) حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں نہ کوئی قوم خدا کی چہیتی اولاد ہے نہ سوتیلی اولاد۔ نتائج بہ اندازۂ عمل خدا کا اٹل قانون ہے جسے ہر قوم اختیار کر سکتی ہے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

تشنہ از حال بگیرند و گزشتند ز قال

نکتۂ فلسفہ دُرد تہ جام است ایں جا

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی قوم جس کی زبوں حالی اقوام عالم کے لئے وجۂ عبرت و موعظت تھی، آج اس کی ترقی اور خوش حالی اس قدر نمایاں ہے کہ دکم از کم مسلمان) اس سے سبق حاصل کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اس تغیر احوال میں انگلستان اور امریکہ جیسی سلطنتوں کا ہاتھ شامل ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ خارجی امداد بھی اسی قوم کے لئے وجۂ تقویت اور باعث استحکام بن سکتی ہے جس نے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلی ہو۔ آج خارجی امداد مسلمان ممالک کو بھی کم نہیں مل رہی لیکن اس سے ان کی بے عملی اور خوئے تن آسانی اور زیادہ بڑھتی جا رہی ہے اور اگر یہی حال رہنا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ کے بعد، یہ تمام جمِ غفیر بھیک منگوں کا ٹولہ بن کر رہ جائے گا۔

اس مسئلہ میں مس (C. Rowe) نے ان مظلوک الحال عرب پناہ گزینوں کے متعلق بھی ضمناً کچھ لکھا ہے جن کی تم رسیدگی اور خستہ حالی ہر قلبِ حساس میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ ان پناہ گزینوں کی تعداد کم و بیش نو لاکھ ہے۔ اور اندازہ یہ ہے کہ اگر حسن انتظام کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی جائے (ان کے بسانے پر کم از کم چھتیس کروڑ پونڈ صرف آئیگا۔ آگے لکھتے ہے جو مصنف (نہایت ہمدردانہ انداز سے) پوچھتی ہے کہ

اس صرفِ خطیر کو کون برداشت کرے گا، اور اس حسنِ نظم و نسق کو (جس کا عربوں میں پہلے ہی فقدان ہے)

کون کہاں سے لائے گا؟

اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ مصر اور لبنان میں پہلے ہی آبادی زیادہ ہے (اگرچہ مصر نے قریب ساٹھ ہزار پناہ گزینوں کے بسانے کا ذمہ لے لیا ہے)

سعودی عرب (تیل سے حاصل شدہ دولت کے باوجود) اس کی استطاعت ہی نہیں رکھتا کہ اتنے نفوس کی پرورش کا انتظام کر سکے۔ شام میں اس قدر رقبہ تو موجود ہے جو اس کے اٹھاسی ہزار پناہ گزینوں کو اپنے اندر سمولے لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں۔ عراق اپنے وسائل و ذرائع کو ترقی دے رہا ہے لیکن اسکی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ آئندہ بیس سال میں بھی اس خانماں برباد قبائل کو اپنے ہاں جگہ دے سکے۔ شرق اردن کی حالیہ آبادی قریب پندرہ لاکھ ہے جس میں قریب پانچ لاکھ پناہ گزیں ہیں۔ ان میں قریب ایک لاکھ ساٹھ ہزار بیکار ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک شرق اردن کو قریب گیارہ کروڑ چار لاکھ پونڈ باہر سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ساڑھے سات کروڑ پونڈ برطانیہ سے (عرب لیجن کے سلسلہ میں) وصول ہوئے ہیں۔ (اب یہ سلسلہ بھی ختم ہوچکا ہے) ساڑھے تین کروڑ پونڈ مجلس اقوام متحدہ نے پناہ گزینوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ اور امریکہ سے صرف چالیس لاکھ پونڈ ملے ہیں۔ اس امریکہ سے جس نے یہودیوں کو اسی عرصہ میں ساڑھے دس کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم دی ہے۔

مس (GROWE) نے ان اعداد و شمار کے بعد بتایا ہے کہ ان پناہ گزینوں میں سے کم از کم پانچ لاکھ کو کہیں باہر بسانا پڑے گا۔

ان پناہ گزینوں کے علاوہ قریب ایک لاکھ بیس ہزار کی آبادی ان تباہ حال عربوں پر مشتمل ہے جو اسرائیلی علاقہ کی سرحدوں پر بستے ہیں۔ ان کے باغات چھن چکے ہیں۔ انکی مزروعہ اراضیات اسرائیلیوں کے قبضہ میں جاچکی ہیں۔ ان کا اب کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے دیہات کے سامنے بیس تیس گز کے فاصلہ پر ان چشموں اور نالیوں کو دیکھتے ہیں جن میں صاف اور شفاف پانی بہہ رہا ہے۔ اور جو ابھی چند دن پہلے ان کے تصرف میں تھا لیکن انہیں اب پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے بیس بیس میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان کی حالت پناہ گزینوں سے بھی بدتر ہے۔ اس لئے کہ پناہ گزینوں کو U.N.R.R.A (اقوام متحدہ) کی طرف سے راشن ملتا ہے۔ لیکن یہ لوگ چونکہ ابھی اپنے گھروں سے نہیں نکالے گئے۔ اس لئے اصطلاحی طور پر انہیں پناہ گزینوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا انہیں راشن تک بھی نصیب نہیں۔

---x---

ہم نے ان اعداد و کوائف کو سینہ پر پتھر رکھ کر، اس لئے شائع کیا ہے کہ ان سے شاید سینۂ امت میں ذرا سا جذبۂ غیرت بیدار ہوجائے چشم ملت سے چار آنسو ہی ٹپک پڑیں!

اسے دوبارہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ

مسلمانوں کا یہ حشر یہودیوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے! ان
یہودیوں کے ہاتھوں جن کی (فلسطین) آبادی کراچی شہر کی
آبادی سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

ڈوب مرنا!

اسلام کی سرگزشت

علمی حرکت کا اجمالی بیان

(مسلسل)

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تمام کے تمام صحابہ علمی اعتبار سے ایک ہی پایہ کے نہیں تھے۔ علمی اور فقہی اعتبار سے ان میں بڑا ہی نمایاں تفاوت تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ تمام صحابہ کے علمی میدان بھی یکساں نہیں تھے۔ کوئی کسی ایک باب میں خصوصی امتیاز رکھتا تھا تو کوئی کسی دوسرے باب میں۔ یہ فرق اور تفاوت ہر طبقہ کے صحابہ میں پایا جاتا تھا۔

طبقہ اول کے صحابہ پر ان کی علمی تاریخ پڑھنے کے بعد ــــ جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کی علمی شخصیتیں بڑی ہی مختلف نوعیت کی ملتی ہیں ــــ مثال کے طور پر ــــ حضرت عمرؓ کو لے لیجئے۔ نہ تو ہمیں ان کے زیادہ اقوال تفسیر قرآن سے متعلق ملتے ہیں۔ اور نہ ہی ہمیں ان کی شخصیت بکثرت احادیث کو جمع کرنے والی نظر آتی ہے۔ البتہ ان کا بڑا امتیاز ــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔ ــــ چیزوں پر حکم لگانے کی فطری قوت ہے۔ نیز عدل اور ظلم کی پہچان میں اصابت رائے' اور اس دنیا کی وسیع معلومات جو انھیں محیط تھی۔ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے ہوئے سنا کہ "خدا نے حق کو عمرؓ کی زبان پر جاری کر دیا ہے جو حق بات ہوتی ہے اسے ان کی زبان سے کہلوا دیتا ہے"۔

حضرت عمرؓ کے اس امتیاز سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کن معاملات میں حضرت عمرؓ کی رائے معلوم ہو جانے کے بعد کسی دوسرے کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کی عقل عدالتی عقل ہے۔ وہ لوگوں کو فتوے دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلعم کی زندگی میں بھی مشکلات مسائل میں ان سے بہت سے احکام نقل کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کے بارے میں ان کی فراست کہ کس شخص کو کونسا کام دیا جائے بہت ہی صحیح ہوتی تھی۔ عقد الفرید میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کو حضرت عبداللہ بن عباس بہت ہی محبوب تھے۔ حتیٰ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے صحابہ پر ان کو مقدم رکھتے تھے۔ لیکن ساری عمر میں کبھی بھی ان کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ بلکہ ایک دن فرما ہی دیا کہ میں تمہیں گورنر بنانے لگا تھا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ تم تاویل کے ذریعے سے مال فئی کو اپنے لئے حلال کر لو گے پھر جب خلافت حضرت علیؓ کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے عبداللہ ابن عباسؓ کو بصرہ کا گورنر بنا دیا مگر حضرت عمرؓ کا یہ اندیشہ صحیح

ثابت ہوا۔ اور ابن عباس نے حق تعالیٰ کے ارشاد وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى کی تاویل پر مال نے کو اپنے لئے حلال کر لیا۔ اسی طرح ظاہر ہے کہ مملکت اسلامیہ کی عظیم وسعت کے باوجود انتظام کی اہلیت اور ان بڑے بڑے امور کا سامنا کرنے کی ہمت کے لئے جو فتوحات اسلامی کے بعد پیدا ہوئے ایک بڑی عقل کی ضرورت تھی جو ان امور کا انتظام کر سکے اور ان کے لئے قوانین بنا سکے۔ بلاشبہ اس قسم کے مسائل رسول اللہ صلعم اور صدیق اکبرؓ کے عہد میں موجود نہیں تھے یہ تمام باتیں اور حضرت عمرؓ کی ان میں کامیابی ـــ بلاشبہ ـــ ہمیں حضرت عمرؓ کی وسعت علمی کا لوہا ماننے پر مجبور کر دیتی ہیں اس سے ہم اس علم کی نوعیت کا بھی تصور کر سکتے ہیں جس میں حضرت عمرؓ ممتاز تھے۔

حضرت عمرؓ کے برعکس ہمیں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نظر آتے ہیں۔ یہ بھی علماء صحابہ میں سے ایک ہیں۔ لیکن عبداللہ ابن عمرؓ جو علمی تصویر ہمیں دیتے ہیں وہ اس تصویر سے قطعاً مختلف ہے جو حضرت عمرؓ نے ہمیں دی تھی۔ یہ حدیثوں کو بڑا جمع کرنے والے تھے جہاں سے حدیثیں ملتی تھیں۔ انھیں تلاش کرتے تھے۔ اور پوری باریکی کے ساتھ ان الفاظ کو بعینہٖ نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو رسول اللہ صلعم نے فرمائے ہوں۔ ابو جعفر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے اصحاب میں عبداللہ ابن عمر بن الخطابؓ سے زیادہ اس امر کا خوف رکھنے والا کوئی صحابی نہیں تھا کہ جب وہ آپ کی کوئی بات سنے تو اسے بعینہٖ نقل کرے۔ نہ اس میں کمی کرے نہ زیادتی کرے اور نہ کوئی اور تبدیلی کرے۔ لیکن اس کے باوجود ـــ جیسا کہ شعبیؒ نے کہا ہے ـــ حدیث میں تو عمدہ تھے مگر فقہ اور سمجھ میں عمدہ نہیں تھے[1]۔ تقویٰ اور خوف خدا نے انھیں بکثرت فتوے دینے اور مسلمانوں کے باہمی فتنوں میں عملی حصہ لینے سے باز رکھا۔ ابن الاثیر کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ فتوے دینے میں اپنی دینداری کی وجہ سے سخت احتیاط برتتے تھے بلکہ ان تمام چیزوں میں نہایت احتیاط برتتے تھے جہاں ذرا سا بھی نفس کا شائبہ ہو۔ وہ خلافت کے معاملے میں منازعت سے قطعاً کنارہ کش رہے۔ حالانکہ اہل شام کا ان کی طرف میلان تھا اور وہ ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے باہمی فتنوں میں وہ کبھی شریک نہیں ہوئے اور حضرت علیؓ نے جتنی لڑائیاں لڑیں انھوں نے ان میں کوئی حصہ نہیں لیا[2]۔

یہ بات مشہور ہے کہ ان تاریخی حوادث کے بیان کرنے میں جو ابتداء اسلام میں پیش آئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ قابل اعتماد ہیں کیونکہ ان کو رسول اللہ صلعم سے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء سے برابر لگاؤ اور اتصال رہا اور انھیں ان چیزوں کے معلوم کرنے کا بڑا اہتمام تھا۔ اس سے تم نے دیکھ لیا کہ عبداللہ ابن عمرؓ کی علمی شخصیت کا امتیاز احادیث کی کثرت جمع اور دقت نقل ہے۔ کثرت استنباط یا کثرت فتوے نہیں ہے۔

ایک تیسرا نمونہ ہمیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ میں نظر آتا ہے۔ تفسیر اور سیر کی کتابیں ان کا جو کچھ تصور پیش کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مختلف نواحی میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ شعر، انساب۔ ایام عرب پر ان کی نظر تھی۔ صحابہؓ کے پاس جو کچھ

---

(۱) طبقات ابن سعد ص ۱۲۵ ج ۲۔ (۲) اسد الغابہ ص ۲۲۸ ج ۲

احادیث یا علم ہوتا تھا ان سے معلوم کرنے کی وہ کوشش کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی زیادہ تر حدیثیں انصار کے پاس تھیں اور ان میں بہت کسی کے پاس جاتا اور اسے سویا ہوا پاتا۔ اگر میں چاہتا تو میری خاطر انہیں جگا بھی جا سکتا تھا لیکن میں ان کے دروازے پر بیٹھا رہتا اور ہوائیں میرے چہرے پر گرد و غبار اڑاتی رہتیں۔ حتیٰ کہ جب انھیں خود ہی جاگنا ہوتا تو وہ جاگ جاتے اور جو کچھ مجھے ان سے دریافت کرنا ہوتا وہ دریافت کر کے چلا جاتا۔ تفسیر قرآن کے بارے میں جو حدیثیں آتی ہیں ابن عباسؓ کو ان کا علم تھا۔ اسباب نزول پر بھی انھیں کافی دسترس تھی۔ فرائض اور مغازی کے متعلق بھی ان کی معلومات کافی تھیں۔ دوسری کتابوں مثلاً توراۃ اور انجیل کے متعلق بھی ان کا علم وسیع تھا۔ ان کی بیشتر زندگی علمی زندگی ہی گذری۔ پڑھنا پڑھانا ان کا شغل تھا۔ امارت اور گورنری سے زیادہ شغف نہیں تھا۔ صرف تھوڑے سے عرصے کے لئے وہ گورنر بنے جبکہ حضرت علیؓ نے انھیں بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے لمبی عمر پائی تقریباً سنہ ۶۸ھ میں تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ عبداللہ عمرؓ ان کو قرآن کی تفسیر میں بے جا جرأت کے ساتھ متہم فرماتے تھے۔ مگر بعد میں انھوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی تھی[1]

اس سے ہمیں ایک نئی تصویر نظر آتی ہے جو پہلی دو تصویروں سے مختلف ہے۔ اس میں ہم زندگی کو علم کے لئے ایک گونہ مخصوص کر دینے اور علم کے مختلف نواحی میں وسعت معلومات بہم پہنچانے کا رنگ دیکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے نام کے ساتھ بہت کچھ مبالغے بھی ملتے ہیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مبالغے دولت عباسیہ کی پیداوار ہیں کیونکہ وہ ان خلفاء کے جد امجد تھے لیکن بہرحال ان مبالغوں کی بھی ایک صحیح بنیاد ضرور تھی جو وسعت علم اور قوت حجت تھی۔ ان کے زیادہ تر اقوال قرآن کی تفسیر کے بارے میں مشہور ہیں۔ ان کے بعد ایک چوتھی شخصیت ہے جس کی تصویر تمام تصویروں سے زیادہ مشکل ہے اس میں اس قدر مبالغے اور اکاذیب داخل ہو چکے ہیں کہ ایک مؤرخ حیران و پریشان ہو کر کھڑا رہ جاتا ہے کہ کس بات کو صحیح مانے اور کس بات کو غلط۔ یہ شخصیت حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی ہے۔

اس عہد کی کوئی اور ایسی شخصیت نہیں جس کے گرد اتنے اختلافات گھومتے ہوں اور جس کے بارے میں پسند کرنے والوں اور ناپسند کرنے والوں نے اس قدر افراط سے کام لیا ہو بلکہ اس کے نام کے ارد گرد اس قدر باتیں گڑھی گئی ہوں اور جس کی وجہ سے مختلف دینی مذاہب کی بنیاد پڑ گئی ہو۔ یہ سب باتیں حضرت علیؓ کی شخصیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ لوگوں نے ان سے تقریباً ۸۶ حدیثیں نقل کی ہیں جو سب کی سب رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب ہیں۔ مگر ان میں سے تقریباً پچاس حدیثیں ہی صحیح ہو سکتی ہیں[2]۔ لوگوں نے ان کی طرف اشعار کا ایک پورا دیوان بھی منسوب کر رکھا ہے۔ مگر مازنی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کے متعلق صحت کے ساتھ اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے کبھی کوئی شعر بھی کہا ہو بجز ان دو شعروں کے ؎

تِلْكُمْ قُرَيْشٌ تَمَنَّانِي لِتَقْتُلَنِي   فَلَا وَرَبِّكَ مَا بَرُّوا وَلَا ظَفِرُوا

---

[1] اتقان ج ۲۔   [2] الفصل فی الملل والنحل لابن حزم ص ۱۳۷ ج ۴

فَاِنْ هَلَكْتُ فَرَهْنٌ ذِمَّتِي لَهُمْ ، بِذَاتِ وَدْقَيْنِ لَا يَعْفُو لَهَا اَثَرُ

یہ قریش ہیں جو مجھے قتل کرڈالنے کی تمنائیں رکھتے ہیں۔ تیرے پروردگار کی قسم اس آرزو میں
نہ انھوں نے نیکوکاری کا ثبوت دیا نہ عقلمندی کا۔ اگر میں ہلاک ہوگیا تو مصیبت میں میری
ذمہ داری ان کے لئے رہن ہے جس کا اثر کبھی نہ مٹے گا نہیں۔[1]

ان کی طرف وہ تمام چیزیں منسوب کی گئی ہیں جو نہج البلاغت میں ہیں یہ کتاب بہت سے خطبوں، دعاؤں، خطوط، مواعظ اور حکم پر مشتمل ہے۔ ناقدین قدیم زمانہ میں بھی اور آج بھی ان تمام چیزوں میں شک کرتے رہے ہیں، مثلاً صفدی اور ہوار (HUART)[2] اس شک شبہ کی موجب چند چیزیں ہیں ان پر مبالغہ کیساتھ قافیہ و سجع کی رعایت اور صنائع لفظیہ کا پورا اہتمام ملتا ہے ___ جو حضرت علیؓ کے عہد میں قطعی غیر معروف تھا ___ مثلاً حضرت علیؓ کا یہ قول اَكْرِمْ عَشِيْرَتَكَ فَاِنَّهُمْ جَنَاحُكَ الَّذِيْ بِهٖ تَطِيْرُ وَاَصْلُكَ الَّذِيْ اِلَيْهِ تَصِيْرُ اپنے خاندان کی عزت کرو کیونکہ وہ ہی تمہارا بازو ہیں جس کے ذریعہ سے تم اڑ سکتے ہو اور وہی تمہاری اصل اور بنیاد ہیں جن کی طرف تم لوٹ سکتے ہو ___ یا ایسے اقوال جن میں اس قسم کی تعبیرات ہیں جو فلسفۂ یونانی کے عربی میں منتقل ہو جانے اور علوم و فنون کے مدون و مرتب ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی تھیں۔ مثلاً یہ قول دیکھئے اَلْاِسْتِغْفَارُ عَلٰى سِتَّةِ مَعَانٍ وَالْاِيْمَانُ عَلٰى اَرْبَعَةِ دَعَائِمَ استغفار کے چھ معانی ہوتے ہیں اور ایمان کے چار ستون ہوتے ہیں یا وہ قول جس میں مکان کا بیان کیا گیا ہے اور اس کی ایسے حدود بیان کی گئی ہیں جو ایک انجینیر کے حدود بیان کرنے سے ہی زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً دیکھئے تَجْمَعُ هٰذِهِ الدَّارَ حُدُوْدٌ اَرْبَعَةٌ اَلْحَدُّ الْاَوَّلُ يَنْتَهِيْ اِلٰى دَوَاعِي الْاٰفَاتِ ..... الخ اس گھر کو چار حدود احاطہ کرتی ہیں۔ پہلی حد آفات کے دواعی اور اسباب پر ختم ہوتی ہے اسکے علاوہ ایسے اقوال بھی ہیں، جن میں نہایت دقیق مضامین بیان کئے گئے اور ایسے اسلوب میں بیان کئے گئے ہیں جو عباسی عہد سے پہلے عربوں میں، مانوس تو در کنار معروف بھی نہیں تھا، چنانچہ مور کی تعریف میں حضرت علیؓ کے اقوال دیکھئے۔ لوگوں نے ان کی طرف جفر کی ایک کتاب بھی منسوب کی ہے جس میں ان تمام حوادث کا بیان موجود ہے جو دنیا کے خاتمہ تک پیش آئیں گے۔ ابوالاسود دؤلی کے ساتھ علم نحو کی ایجاد کے بارے میں حضرت علیؓ کی حکایت تو کافی سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ یہ وہ تمام باتیں ہیں جو ایک ناقد مؤرخ کے لئے ان کی علمی شخصیت کو اس طرح بیان کرنا نہایت ہی دشوار کر دیتی ہیں جس پر وہ خود مطمئن ہو سکے۔ نہج البلاغت میں جتنا کچھ ہے اس میں سے کتنا حضرت علیؓ کا ہے اور کتنا ان کا نہیں ہے؟ جو حکم اور امثال ان سے نقل کی جاتی ہیں، ان میں سے کتنی ان کی ہیں اور کتنی ان کی نہیں ہیں؟ کتنی احادیث اور کتنے احکام ان کے ہیں اور کتنے ان کے نہیں ہیں؟ خلفاء نے مختلف حالات و ظروف میں جو ان سے مشورے کئے ان میں سے کتنے صحیح ہیں اور کتنے غلط ہیں؟ یہ تمام چیزیں ہمیشہ سے محل بحث رہی ہیں اور ہمیشہ ہی رہیں گی۔

بہرحال جب ہم قابلِ اعتماد کتب سیر مثلاً طبقات ابن سعد جیسی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ

۱؎ ایضاً   ۲؎ ہماری کتاب "الادب العربی"

حضرت علیؓ بھی عدالتی عقل کے مالک تھے۔ رسول اللہ صلعم نے آپ کو یمن کی قضا پر مقرر فرمایا تھا۔ ان کی چند آرا مشکل قضائی معاملات میں نقل کی جاتی ہیں جن کی صحت ثابت ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ قول بھی مشہور رہے "قَضِيَّةٌ وَلَا أَبَا حَسَنٍ لَهَا" یہ ایک مشکل قضیہ ہے مگر اس کو حل کرنے کے لئے کوئی ابوالحسن نہیں ہے۔ علقمہ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ہم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ مدینہ والوں میں سب سے بہتر فیصلہ دینے والے حضرت علیؓ ہیں۔ مزید براں حضرت علیؓ کو قرآن کا بھی کافی اہتمام تھا۔ قرآن کے معانی و مطالب پر ان کو عبور حاصل تھا اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کون کون آیات کس کس بارے میں نازل ہوئیں۔ حتیٰ کہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ترتیب نزول کے مطابق قرآن کو جمع بھی کیا تھا۔[1] قرآن کے بارے میں آپ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے استاد تھے انھوں نے حضرت علیؓ سے کافی استفادہ کیا تھا۔ لوگ ان دونوں میں موازنہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کو قرآن کا زیادہ علم تھا اور حضرت علیؓ کو مبہمات قرآن کا زیادہ علم تھا۔[2]

اگر تمام مشہور صحابہ کے علمی امتیازات کو ہم بیان کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابوالدرداءؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوذرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ۔ تاہم مختصراً ہم اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا شخصیتیں ہی مشہور ترین علمی نواحی کی وضاحت کر دیتی ہیں۔ دوسرے بعد میں جن حضرات کے نام ہم نے گنائے ہیں وہ ان تمام نواحی میں یا بعض نواحی میں ان حضرات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ابوالبختری سے نقل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ ہم لوگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ہم نے محمد صلعم کے اصحاب کے متعلق سوال کیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کہ کون سے صحابہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان فرمایئے۔ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ انھوں نے قرآن اور سنت کا علم حاصل کیا اور اس کی انتہا کو پہنچ گئے۔ اس کا علم بڑا کافی ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ اچھا ذرا ابوموسیٰؓ کے متعلق بیان فرمایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ علم میں اچھی طرح رنگ دیئے گئے لیکن پھر اس سے نکل گئے۔ ہم نے کہا کہ ذرا عمار بن یاسرؓ کے متعلق بیان فرمایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ ایک ایسے مومن آدمی تھے جو بھول چوک کا شکار ہو جاتے تھے لیکن جب انھیں یاد دلایا جاتا تھا تو انھیں یاد آ جاتا تھا۔ ابوالبختری کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ ذرا حذیفہؓ کے متعلق بتلایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں منافقوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ ہم نے پھر عرض کیا کہ ذرا ابوذرؓ کے متعلق بتلایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ انھوں نے علم کو محفوظ تو کیا مگر پھر اس میں درماندہ رہ گئے۔ اس کے بعد ہم نے عرض کیا کہ اچھا اب سلمانؓ کے متعلق بتایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ سلمان نے علم اول اور علم آخر دونوں سے حصہ پایا تھا۔ وہ ایک سمندر تھے جس کی تہہ نہیں پائی جا سکتی۔ وہ ہم میں سے تھے یعنی اہل بیت میں سے تھے۔ اس کے بعد ہم نے عرض کیا کہ اچھا اب ذرا اے امیرالمومنین خود اپنے متعلق تو بتایئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اوہ! یہی تو تم پوچھنا چاہتے تھے اچھا تو سنو! جب میں کچھ پوچھتا تھا تو مجھے اس کا جواب دیا جاتا تھا اور جب میں خاموش رہتا تھا تو از خود مجھے بتایا جاتا تھا۔[3] لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم دو خاص عالموں کے متعلق کچھ عرض کر دیں تو بیجا

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۰۱ ج ۲ قسم ثانی۔ [2] ایضاً۔ [3] مطلب یہ ہے کہ جب میں نبی صلعم سے کچھ پوچھتا تھا تو آپ مجھے جواب دیتے تھے اور جب میں خاموش رہتا تھا تو آپ مجھ سے خود ہی سوال کرنے لگتے تھے۔ تاکہ مجھے اس طرح استفادہ کا موقع عطا فرمائیں۔

نہیں ہوگا۔ ان دونوں کا ایک خاص علمی میدان تھا۔ یہ دونوں بزرگ عبداللہ بن سلامؓ اور سلمان فارسیؓ ہیں۔

جہاں تک عبداللہ بن سلامؓ کا تعلق ہے وہ یہودی تھے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر یہودی تہذیب و ثقافت کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ مفسرین نے انھیں ان ابتدائی لوگوں میں شمار کیا ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا تھا اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔ وہ مدینہ منورہ کی طرف رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے بعد اسلام لائے ——— ایک قول یہی ہے ——— اور حضرت عمرؓ کے ساتھ سفر شام میں ہمرکاب تھے۔ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کر رہے تھے ان کو انھوں نے خطبہ دیا تھا اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے مدافعت کی تھی۔ ان سازشیوں سے انھوں نے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور تقریباً سنہ ٤٣ھ میں انتقال فرمایا۔ صحابہ میں علمی اعتبار سے کافی مشہور تھے حتیٰ کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت معاذؓ نے ان چار آدمیوں میں سے ایک آدمی ان کو شمار کیا ہے جن سے علم طلب کرنے کی انھوں نے وصیت فرمائی تھی۔ مسلمانوں نے ان سے بہت سی باتیں نقل کی ہیں جن سے تورات اور متعلقات تورات کے متعلق ان کی علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے نام سے زیادہ تر اسرائیلیات منسوب کی جاتی ہیں۔ ان سے ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ نے حدیثیں نقل کی ہیں۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں ان کے بہت سے اقوال جو تاریخی اور دینی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں نقل کئے ہیں۔

بہر حال وہ ہمارے لئے ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی اس پہلو کی جس کے ذریعہ مسلمانوں میں تورات اور اس کے متعلقات کے بعض اقوال داخل ہوئے اور جن میں سے بعض اقوال قرآن کریم کی تفسیر اور اقوام سابقہ کے حالات پر چسپاں ہو گئے۔ اس موضوع پر ہم آئندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

رہ گئے سلمان فارسیؓ ——— اگر محمد بن اسحٰق کی روایت صحیح ہے تو ——— سلمان فارسی اسلام لانے سے پہلے مختلف ادیان میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ یہ مجوسی اور بڑے مخلص مجوسی تھے (حتیٰ کہ یہ آتشکدہ مجوس کے آگ سلگانے والوں میں تھے) اس کے بعد انھوں نے نصرانیت قبول کر لی۔ اور اس مذہب کے پیشواؤں اور مقتداؤں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی۔ اس کے بعد یہ ایک بنو قریظہ کے یہودی کے غلام ہو گئے (مگر یہودی مذہب اختیار نہیں کیا) اس کے بعد اسلام لائے اور بڑے ہی مخلص مسلمانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ اسلام لانے سے پہلے وہ بے شمار شہروں میں رہ چکے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ دراصل اصفہان کے رہنے والے ہیں۔ پھر نصرانیت کی تلاش میں ملک شام پہنچے اور وہاں سے موصل آئے پھر موصل سے نصیبین اور پھر وہاں سے عموریہ (سرزمین روم) اور اس کے بعد اسلام کی جستجو میں جزیرۃ العرب میں پہنچے اور وادی القریٰ میں قیام کیا۔ وہاں بنو کلب کے ایک قبیلے نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا اور انھیں گرفتار کر کے فروخت کر دیا۔ جہاں سے وہ مدینہ پہنچے اور اسلام لے آئے۔[1]

---

[1] یہ قصہ مفصل ابن سعد کی طبقات جلد چہارم صفحہ ٥٣ اور مابعد میں مذکور ہے۔

اس سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ سلمان فارسیؓ کو مختلف ادیان کا گہرا علم تھا۔ شاید حضرت علیؓ کی مراد اپنے اس قول سے۔ ان کی اسی خصوصیت اور امتیاز کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ لقمان حکیم جیسا آدمی تم میں کون ہے جس نے پہلا اور پچھلا دونوں علم حاصل کئے۔ پہلی کتابیں اور پچھلی کتابیں پڑھیں اور ایک ایسا سمندر بن گیا جس کی تھاہ کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ان کی سیرت سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دینی رجحان زہد و ورع کا رجحان تھا۔ ان کا حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں انتقال ہوا۔

ایران کے مسلمانوں نے ان کو ایک قابلِ فخر نمونہ اور اسوہ قرار دیا ہے ــــ جیسا کہ اہل حبش نے بلالؓ کو اور اہل روم نے صہیبؓ کو ــــ نسلی غرور اور تعصب رکھنے والے ان پر فخر کرتے ہیں۔ شیعوں نے ان کا ربط وضبط علیؓ حسنؓ اور حسین رضی اللہ عنہم سے ثابت کیا ہے۔ اور صوفیوں نے ان کو اپنے تصوف کے بانیوں میں سے ایک شمار کیا ہے۔ ایرانیوں نے ان کے بارے میں بڑے ہی مبالغہ سے کام لیا ہے اور بہت سی چیزیں ان کی طرف منسوب کر ڈالی ہیں۔

مذکورہ بالا اجمالی بیان یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ صحابہؓ کے دور میں علمی حرکت شروع ہو چکی تھی اور اس حرکت کا زیادہ تر حصہ دینیات سے متعلق تھا۔ جس کی جہات اور شخصیات مختلف تھیں۔

یہ علماء اور ان جیسے صحابہؓ مملکت اسلامیہ کے اطراف و جوانب میں پھیل گئے تھے۔ تم یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ لوگوں کو تعلیم و تربیت دینے کے لئے ان کو ملک کے اطراف و جوانب میں قصداً پھیلا دیا گیا تھا۔ خود رسول اللہ صلعم نے جزیرۂ عرب کے شہروں میں صحابہ کو بھیجا چنانچہ یمن، بحرین اور مکہ کی طرف ــــ فتح مکہ کے بعد ــــ مختلف صحابہ کو بھیجا گیا۔ جب فتوحات کو وسعت حاصل ہوئی اور اسلامی مملکت میں بکثرت شہر داخل ہو گئے، تو حضرت عمر بن الخطابؓ نے بھی یہی کیا۔ سالم ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ جس روز حضرت زید بن ثابتؓ کا انتقال ہوا ہے تو ہم لوگ ابن عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ آج لوگوں کے ایک عالم کا انتقال ہو گیا۔ اس پر ابن عمرؓ نے فرمایا کہ خدا ان پر رحم فرمائے۔ درحقیقت وہ لوگوں کے ایک عالم اور امام تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں عمرؓ نے مختلف شہروں میں پھیلا دیا تھا[1]۔

عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ــــ جب حضرت معاذ بن جبلؓ شام کی طرف تشریف لے گئے ــــ فرمایا ان کے چلے جانے سے اہل مدینہ کو فقہی مسائل میں بہت نقصان پہنچا کیونکہ وہ انھیں فتوے دیا کرتے تھے۔ میں نے ابوبکرؓ سے ان کے بارے میں گفتگو کی تھی اور درخواست کی تھی کہ اس ضرورت کے پیش نظر جو معاذؓ سے لوگوں کی وابستہ ہے آپ ان کو روک لیجئے مگر انھوں نے میری درخواست رد کر دی اور فرمایا کہ جو آدمی جہاد کی نیت سے جا رہا ہے اور شہادت کی آرزو رکھتا ہے میں اسے

---

[1] طبقات ابن سعد صہ۶۱ ج ۲

کیسے روک لوں۔ اس پر میں نے ابوبکرؓ سے دوبارہ اصرار کیا اور کہا کہ بخدا شہادت تو خدا کی طرف سے آدمی کو بستر پر پڑ کر بھی مل سکتی ہے..... الخ[1] حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو لکھا تھا کہ "میں تمہارے پاس عبداللہ ابن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اور میں نے اپنی ذات پر تم لوگوں کو ترجیح دے کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ لہٰذا تم ان سے تحصیل علم کرو۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں تشریف لائے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ اور مسجد کوفہ کے پہلو میں انھوں نے اپنے لئے مکان بنا لیا۔ بہرحال اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ان علمائے صحابہؓ نے جو مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے، علمی حرکت کا آغاز کیا۔ ہر شہر میں یہ لوگ پہنچتے اور مدارس قائم کر دیتے۔ ان کے شاگرد..... جو ان سے علم حاصل کرتے اور پھر اسے آگے کی طرف منتقل کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے تابعین نے علم حاصل کیا اور پھر تابعین سے تبع تابعین نے جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے جہاں حرکت عقلی کے مراکز سے بحث کی جائے گی۔

اس عہد میں موالی اور ان کی اولاد کا عنصر علمی حرکت میں داخل ہو چکا تھا اور اس کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ چنانچہ تابعین اور تبع تابعین میں بہت سے سرآوردہ لوگ ان ہی موالی میں سے تھے۔

---

[1] ایضاً قسم دوم ص۱۱۷ ج ۲ [2] مدارس کا لفظ ہم یہاں اسکے وسیع تر معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جس سے ہمارا مقصد حرکت علمیہ کی تعلیم کیلئے کوئی مخصوص عمارت نہیں ہے۔

تفسیر بیان القرآن

یہ تفسیر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی نادر تالیف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان کی موجودہ تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں تو قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا حقیقتاً یہ تفسیر اور ترجمہ قرآن پاک ہر مسلمان کے پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ (نمونے کے صفحے مفت منگوا کر ملاحظہ فرمائیے)

تاج کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵۳۰ کراچی

Starlit
TRADE MARK
TYPEWRITER RIBBONS
GEM CLIPS
PAPER FASTENERS
STAPLES
THUMB TACKS
INK
پورے پاکستان میں
عام اسٹیشنری صرف یہی فیکٹری تیار کر رہی ہے
اسکی مصنوعات آپ کا اپنا قومی سرمایہ ہیں
MADE IN PAKISTAN
GENERAL STATIONERS LTD
S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI
اب غیر ملکی عام اشیائے اسٹیشنری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے
کیونکہ ہم نے ال کے بنانے میں اسی خوشنمائی پائیداری اور معیار کو ملحوظ رکھا ہے جو انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ وغیرہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار ملک کی مصنوعات کو استعمال کرنے پر ہے۔
جنرل مینیجر:- جنرل اسٹیشنرز لمیٹڈ (مینوفیکچرز)

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MAKES
TEETH
WHITE

چن بسویشور اور ان کی جماعت

پرویز

مئی ۱۹۵۶ء کے طلوعِ اسلام میں، حیدر آباد (دکن) کے پروفیسر برنی صاحب کے ایک مختصر سے پمفلٹ پر تبصرہ شائع ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ جو آپ کو پاکستان کے مختلف خطوں میں لمبے لمبے بالوں کے اوپر سبز عماموں والے لوگ (مبلغین اسلام کے لباس میں) دکھائی دیتے ہیں، ان کی اصلیت کیا ہے۔ اس کے بعد جولائی کے طلوعِ اسلام میں، انہی حضرات کی انجمن کے ایک سابق مبلغ (زاہد صدیقی صاحب) کے رسالہ موسومہ "ہندو اوتار" پر تبصرہ شائع ہوا جس میں اس انجمن کے پوست کندہ حالات درج تھے۔

وسط جولائی کے قریب، اس انجمن (دین داران) کے تین نمائندگان ایک وفد کی شکل میں میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ہمیں طلوعِ اسلام سے گلہ ہے کہ اس نے محض سُنی سنائی باتوں پر ہمارے خلاف اتنا کچھ لکھ دیا۔ ہم بالکل سیدھے سادے مسلمان ہیں اور ہمارا کوئی عقیدہ ایسا نہیں جو عام مسلمانوں سے ہٹا ہوا ہو بجز اس کے کہ ہم کسی فرقے سے متعلق نہیں۔ میں نے کہا کہ محض سُنی سُنائی باتوں کی بنا پر کچھ لکھ دینا طلوعِ اسلام کا شعار نہیں۔ یہ جو کچھ لکھتا ہے احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ لکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ حضرات کی انجمن کے مختلف نمائندگان قریب چھ سات برس سے مجھ سے ملتے چلے آرہے ہیں۔ وہ جو کچھ اپنے متعلق بتاتے، دوسرے ذرائع سے مجھے اس کے خلاف اطلاعات پہنچتیں۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ وہ مجھے اپنے بانیٔ تحریک کی کتابیں دیں تاکہ میں براہ راست ان کا مطالعہ کروں۔ لیکن انھوں نے اس سے ہمیشہ گریز کیا اور اپنے شائع کردہ پمفلٹوں سے زیادہ اور کچھ نہ دیا۔ اس پر میں نے اپنے بعض حیدر آبادی دوستوں سے استفسارات کئے اور انھوں نے مجھے عجیب و غریب معلومات بہم پہنچائیں۔

اس پر انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اپنے بانیٔ تحریک کی کچھ کتابیں دیتے ہیں۔ آپ ان کا خود مطالعہ کریں اور اپنا اطمینان کریں کہ ہمارے عقائد میں کوئی خرابی تو نہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تین چھوٹی چھوٹی سی کتابیں مجھے دیں۔ میں نے ان سے کہا

کہ تین کتابیں نہیں بلکہ میں ان کی تمام تصانیف دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی جماعتیں اپنا ایسا لٹریچر عام کرتی ہیں جس میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہ ہو اور اختلافی عقائد و نظریات پر مشتمل لٹریچر باہر نہیں لاتیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کے بانیٔ تحریک کی تمام کتابیں یہاں نہیں ملتیں۔ وہ کوشش کریں گے کہ وہ انھیں ہندوستان سے حاصل کر سکیں۔

چنانچہ وہ تشریف لے گئے اور وہی تین کتابیں میرے پاس چھوڑ گئے۔ میں نے ان میں سے ابھی ایک کا مطالعہ کیا ہے جسے انھوں نے باصرار پیش کیا تھا۔ اس کتاب کا نام ہے "مُہرِ نبوت" جسے (بقول ان کے) قادیانیت کے رد میں لکھا گیا تھا۔ مصنف کا نام ہے "حضرت مولانا صدیق دیندار چن بسویشور صاحب، قبلہ مظہر اللہ۔" کتاب کے شروع میں پیش کرنے والے نے اپنا نام یوں لکھا ہے۔

فقیر۔ مصاحبِ خاص صدیق

خلیفۃ اللہ۔ مظہر اللہ۔ دربانِ رسول اللہ۔

عنوانِ۔ غازی محمود علی القریشی۔ مثیلِ موسٰے۔

یہ عجب بات ہے کہ اس قسم کے خلیفۃ اللہ۔ مظہر اللہ۔ مثیلِ مسیح یا یوسفِ موعود (صدیق صاحب کا دعوٰی یوسفِ موعود کا ہے) نثر میں لکھتے لکھتے، شاعری ضرور فرمانے لگتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب کی شاعری سے "اربابِ ذوق" اچھی طرح واقف ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "مہرِ نبوت" بھی ایک نظم ہے جس کے ساتھ (خود مصنف کے قلم سے) تشریحی نوٹس بھی شائع ہوئے ہیں۔ پہلے آپ اس نظم کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ یہ 'وزن۔ تقطیع۔ تراکیب۔ تلفظ وغیرہ' کے اعتبار سے کس طرح مرزا صاحب کے تتبع میں جا رہی ہے۔ اور کیوں نہ جاتی جبکہ خود مصنف کا بیان ہے کہ وہ آٹھ برس قادیان اور لاہور میں رہ کر "مرزا صاحب کے تحریر کردہ دس ہزار صفحات سے جن میں تین سو جگہ مسئلہ نبوت کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے پورا پورا واقف ہو گیا۔" (صفحہ ۲) - لیجئے۔ نظم حاضر ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

مُہرِ نبوّت

(۱)

نبوت کے اسرار بے انتہا ہیں　　بفضلِ خدا اس کے در مجھ پہ وا ہیں
کہوں رازداری کے اسباب کیا ہیں　　میں اُن کی جگہ ہوں یہ میری جگہ ہیں
کہ عیسیٰؑ تلک جس قدر انبیاء ہیں　　وہ رُفقاءِ کارِ رسولِ خدا ہیں

(۲)

فنا فی الرسولِ خدا جو ہوا ہے　　وہ لاریب حق میں فنا ہو گیا ہے
کہ نبیوں سے دربار اُس کا بھرا ہے　　ہیں رفقاء نبی یہ عجب ماجرا ہے
جو عہدہ خدا کو قرآں میں ملا ہے　　وہی جانشینِ رسولِ خدا ہے

(۳)

نبیّوں کو اُس نے جو رفقا کہا ہے　　یہ لطف ہے نکتہ سمجھنے کی جا ہے

جہاں مَن یُّطِعِ الرَّسُولَ کہا ہے　　فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہ وہیں پر لکھا ہے
رسولِ خدا کا مطیع جو ہوا ہے　　یقیناً خدا کا مطیع وہ ہوا ہے

(۴)

نبوت رسالت ختم ہے النبی پر　　اب ہوگی نہ جاری یہ نعمت کسی پر
یہ ہستی خدمتیں عارضی آدمی پر　　قرآں سے مہر لگ گئی اس وحی پر
ہے فائق ہمارا ولی ہر نبی پر　　صلوٰۃ اور رحمت ہو ہر دم اُسی پر

(۵)

رسولِ خدا کے جو پہلے ولی تھے　　نبوت تھی جاری ولی سب نبی تھے
ولی نام اللہ کا ہے اس سبب سے　　بنے اولیاء سب عجم اور عرب کے
یہ کہلائے سارے خدا ہی کے بچے　　مسیح ہے نمونہ سمجھنے کو اس کے

(۶)

کہ تھا ان کا عہدہ نبی اور مُرسل　　رُسل کہلوائے تھے ایک سے اک افضل
نذیر اور بشیر اور ہادی سے تھے اکمل　　فقط اپنی قوموں میں آخر و اوّل
کتابوں کے حامل تھے میزان لائے　　انہیں پر سبھی فیصلے بھی کرائے

(۷)

ولی کون ہے اُمتِ مسلماں کا　　محدث و غوث ہے امامِ جہاں کا
خلیفہ مجدد و قطب ہے جہاں کا　　ہے مہدیِ وقت اور مسیح ہے زماں کا
ہے ابدال ، اوتاد اور قطب الاقطاب　　وہ ثانی اثنین امام جہاں تاب

(۸)

رسولِ خدا میں فنا ہو کے مسلم　　بروزِ محمد ہے نبیوں کا حاکم
ہے مظہر خدا کا قرآں کا ہے عالم　　ہے قاضیِ حشر حوضِ کوثر کا قائم
ہے اللہ محمد ہی مومن کا حسنہ　　کہ ہے قلبِ مومن میں دونوں کا جلوہ

(۹)

تھا وقت اک نبی جا بجا بن رہے تھے　　فضیلت میں سب ماسوا بن رہے تھے
مجھے صحبتی ان کے کیا بن رہے تھے　　وہ صدیق شہید اتقیا بن رہے تھے
وہاں فیض جو کچھ تھا نبیوں پہ جاری　　وہ تھا فیج اعوج میں نبیوں پہ جاری

(۱۰)

ہوئی ختم خدمت تو عہدہ کہاں کا　　نبی تھا دیں کا تھا دعویٰ جہاں کا
تھا ہر اک نبی خاص قوم و زماں کا　　مرے جب وہ تو ہیں نبی پھر کہاں کا
سراجاً منیرا نبی مسلماں کا　　ہے کافی ہمیں ایک سورج جہاں کا

(۱۱)

نبی گر کوئی خود کو سمجھا ہوا ہے　　یا اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے
رسولِ خدا نے یہ فتویٰ دیا ہے　　وہ کافر ہے کاذب ہے دیوانہ ہے
کہ شیطاں نے ذہن میں اس کو لیا ہے　　یا ابلیس مردود اس کا پیا ہے

(۱۲)

خدا کا نہیں کوئی بیٹا پلوٹا　　کرے جو نبوت کا دعویٰ ہے کھوٹا
یہ اندھے کا لٹھ ہے یا مجنوں کا سوٹا　　خرِ گاؤ زراں ہے یا بے پیندا لوٹا
لدی ہیں کتابیں یہودی ہے ٹوٹا　　وہ جب ہے تھکا ناجلا ہے کا دھوتا

(۱۳)

نہیں کوئی مسلم سے نبیوں سے کچھ کم　　سلامٌ علیکم ہو دونوں پہ پیہم
بڑھائے قدم پھر تو رحمت ہو ہر دم　　نُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ اَئِمَّۃَ عَالَم
بروزِ محمد فنا فی الرسول ہم　　ہمہ انبیاء را رفیقہا می بینم

(۱۴)

زِ نبیوں میں افسر بالا بھی ہوں میں　　اے سالار سالارِ اعلیٰ بھی ہوں میں
کہ مظہر اللہ تعالیٰ بھی ہوں میں　　کہ مصباح حق کا زجاجہ بھی ہوں میں

مجھی کو ملا ثانی اثنین رتبہ
کہ فضلِ خدا سے ہوں مالکِ عقبیٰ

فقیر صدیق دیندار چن بسویشور　　سالار

اس نظم سے آپ نے مصنف کے مبلغ علم کا تو اندازہ لگا لیا ہوگا وہ علم جس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ میں تیرہ سال کی

عمر سے تبلیغ کا دلدادہ ہوں۔ اس دھن میں میں نے مختلف علوم پڑھے۔ ظاہری علوم میں کمال حاصل کرنے کے لئے انگریزی کی تعلیم پائی" (صفحہ ۲۷)

ظاہری علوم کے بعد باطنی کمالات کے متعلق ارشاد ہے۔ "مزید روحانی علوم میں بذریعہ رؤیا مکاشفات حضرت منبع انوار کی زبانِ مبارک سے اور حضرت علی اکرم سے فیض پایا۔"... اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو ۳ رفروری ۱۹۲۷ء کو اپنے کلام سے اپنا مظہر بنا کر بصورتِ فقیر دین دار چن بسویشور کی خدمت پر فائز کیا" (صفحہ ۲۷)

نظم کے ایک مصرعہ میں آپ نے "ثانی اثنین امامِ جہاں تاب" کے الفاظ دیکھے ہیں۔ ان کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں۔

> ثانی اثنین۔ اس وجود کو بارھواں امام مانا گیا ہے۔ وہ امام الناس ہے۔ وہ ثانی الرسول ہے۔ وہ مظہر رب ذوالجلال ہے۔ وہ مشکوٰۃ محمدی کے مصباح کا زجاجہ ہے جس کے وجود سے ذات بابرکت حضرت خاتم النبیین کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ولی کے دربار میں انبیاء جمع رہتے ہیں...... یہ وجود مظہر اللہ کہلاتا ہے دوسرے الفاظ میں اس ولی کے وجود میں بزمانۂ قیامت حضور منبع انوار خود تشریف لاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی وجہ سے یہ وجود بروزِ محمدؐ کہلاتا ہے۔ (صفحہ ۴۳)

آپ کو معلوم ہے کہ ان صفات کے مالک کون بزرگ ہیں؟ سنئے۔

> اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ انسانوں میں آتا ہے۔ اور بروزِ محمدؐ کا مسئلہ تو صاف ہے۔ وہ ثانی الرسول انسان ہے۔ مسلمانوں کی قیامت کے زمانہ میں صدیق دیندار چن بسویشور اللہ کا مظہر بشکلِ دیگر (صفحہ ۴۶)

"اللہ کا مظہر۔ محمد کا بروز۔ جس کے دربار میں انبیاء جمع رہتے ہیں"! (استغفر اللہ۔ استغفر اللہ)

نظم کا آخری بند ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جس میں یہ صاحب خود اپنے متعلق کہتے ہیں۔

کہ نبیوں میں افسرِ بالا بھی ہوں میں
اے سالار، سالارِ اعلیٰ بھی ہوں میں
کہ مظہر اللہ تعالیٰ بھی ہوں میں
کہ مصباحِ حق کا زجاجہ بھی ہوں میں
مجھ ہی کو ملا ثانی اثنین رتبہ
کہ فضلِ خدا سے ہوں مالکِ عقبیٰ

"نبیوں میں افسرِ بالا۔ مظہر اللہ۔ ثانی اثنین۔ مالکِ عقبیٰ" یہ ہیں صدیق دیندار چن بسویشور صاحب۔ ثانی اثنین کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "اس فقیر ہی کا حق ہے کہ وہ کہے کہ حضور منبعِ انوار ظالموں کے ڈر سے غارِ ثور میں چھپ گئے ہیں۔ ایسے وقت میں صدیق ہی ایک یارِ غار ہے" بلکہ اس سے بھی آگے۔

جب مسلمانوں کے زمانے کافروں کی وجاہت اور سطوت کی وجہ سے مرعوب ہو کر منافقت کی طرف مائل ہو جائیں اور لاکھوں مرتد بھی ہو جائیں تو اپنے دین کو سنبھالنے اور پھیلانے کے لئے خود اللہ کو آنا چاہیئے۔

وہ آیا اور مجھ میں اپنا کام کیا۔ (صفحہ ۶۴)

یہ تو رہا خود اپنے متعلق۔ اس کے بعد وہ اپنے متبعین کے متعلق فرماتے ہیں کہ

ایسے ہی وجودوں کے سامنے انبیاء زانوئے ادب طے کئے بیٹھے ہیں۔ (صفحہ ۳۰)

ان میں سے کوئی مثیلِ موسیٰ ہے (صفحہ ۳۵)، کوئی رام اوتار (صفحہ ۳۷)۔ ان میں سے ہر ولی کئی نبیوں کا مثیل ہے (صفحہ ۳۶)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں صدیق چن بسویشور صاحب کے دعاوی اور یہ ہیں ان کی جماعت 'انجمن دیندار' کے عقائد۔ اس کے بعد قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ ان دعاوی اور عقائد کے حاملین کا اس دین سے کس قدر تعلق ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی وساطت سے قرآن میں نازل کیا تھا۔

اسلام جیسا مظلوم بھی دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو کہ جو کسی کے جی میں آئے کہے اور اسے اسلام کی طرف منسوب کرتا جائے!

اس مقام پر ایک اور امر کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ پاکستان میں یہ جماعت اپنے آپ کو مجاہدین فی سبیل اللہ کے نام سے متعارف کراتی ہے اور اپنا مشن یہ بتاتی ہے کہ ہم مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہیں تاکہ ہندوستان سے جنگ کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاد کے لفظ میں مسلمانوں کے لئے بڑی جاذبیت ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر بات کا جائزہ حقائق کی روشنی میں لیا جائے۔ صورت حال یہ ہے کہ پاکستان مسلمانوں کی مملکت ہے۔ اس کی اپنی فوج ہے اور اپنی فارن پالیسی۔ دوسرے ممالک سے صلح و جنگ، مملکت کے فیصلے سے ہو گی۔ اگر مملکت کسی دوسرے ملک سے صلح کے تعلقات قائم رکھنا چاہے گی تو یہ نہیں ہو سکے گا کہ یہاں کی کوئی جماعت اس ملک کے خلاف جہاد کا علم بلند کر دے۔ اور جب مملکت کسی ملک کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گی تو اُس وقت بھی مملکت کی فوجیں لڑائی میں حصہ لیں گی۔ اگر مملکت کو عام شہریوں کے فوجی امداد کی ضرورت پڑے گی تو وہ اس کے لئے قانون نافذ کرے گی۔ لہذا ان حالات میں، پاکستان میں جہاد کی تحریک پھیلانا اور ہندوستان (یا کسی دوسرے ملک) سے جنگ کرنے پر لوگوں کو اکسانا، نہ صرف یہ کہ مستحسن قرار نہیں پا سکتا۔ بلکہ فتنہ کا موجب بن سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانانِ پاکستان ان نازک اور اہم مسائل میں بڑی احتیاط سے کام لیں اور یونہی جذبات میں نہ بہہ جائیں۔

اسلامی معاشرت

(از پرویز - جدید ایڈیشن زیر طبع)

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص بچوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کیلئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

قیمت دو روپے — پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکیگا

معراجِ انسانیت — حضور صلعم کی ذاتِ اقدس و اعظم شرف و مجدِ انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرتِ مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات، ملائکہ، وحی، شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور — کاروانِ نبوت کے درخشندہ تاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۲×۲۹/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ — زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۲×۲۹/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے۔

سلیم کے نام خطوط — مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں انکا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ — مضامین کا مجموعہ جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت — نوعِ انسان کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا کیا حل بتایا ہے دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ غیر مجلد چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتلایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیا؟ صفحات ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ - ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

رابطہ باہمی

مرکزی بزم طلوع اسلام۔ کراچی

گذشتہ ماہ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ انفلوئنزا کے سیلاب دبا کی روک تھام کے لئے بزم کی طرف سے چار طبی مراکز کھولے گئے ہیں۔ بعد میں تین مراکز کا اور اضافہ کیا گیا۔ یہ مراکز دو ہفتہ تک زیر نگرانی محترم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب (صدر مرکزی بزم) بڑی تن دہی اور جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ اور ان میں نو ہزار سات سو مریضوں کا مفت علاج کیا گیا۔ اب تجویز زیر غور ہے کہ شہر میں ایک آدھ مرکز مستقل طور پر رکھا جائے۔ تاکہ خدمت خلق کا یہ سلسلہ التزاماً جاری رہے۔

کنونشن

سابقہ اشاعت میں اطلاع دی جا چکی ہے کہ امسال طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن اکتوبر میں راولپنڈی میں منعقد ہوگی اس ضمن میں حسب ذیل امور خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

(۱) سال گذشتہ کی کنونشن میں جو ریزولیوشن پاس ہوئے تھے۔ تمام بزمیں انھیں اپنے سامنے رکھیں اور جو جو شقیں ان سے متعلق ہیں ان کے متعلق تفصیلی رپورٹ مرکزی بزم کو بھیجیں کہ ان پر کس قدر کام ہوا اور کتنا کام باقی ہے۔ یہ رپورٹیں ۱۵ اگست تک سکریٹری مرکزی بزم کے پاس پہنچ جانی چاہئیں۔

(۲) آئندہ کنونشن میں جو تجاویز پیش کرنے کا ارادہ ہو ان کا مسودہ ۱۵ اگست تک مرکزی بزم کے پاس پہنچ جانا ضروری ہے۔

(۳) تمام بزمیں اپنے مکمل پتے، راولپنڈی بزم کے پاس حسب ذیل پتہ پر جلد از جلد بھیجدیں۔

محمد حنیف صاحب۔ سکریٹری بزم طلوعِ اسلام۔ راولپنڈی

"الکوثر" بالمقابل گورنمنٹ زنانہ کالج۔ مری روڈ۔

(۴) ہر بزم اپنے اپنے ہاں سے کنونشن میں شامل ہونے والے نمائندگان اور مبصرین کی تعداد سے بزم راولپنڈی کو جلد از جلد مطلع کرے۔

(۵) جو حضرات سردست کسی بزم سے متعلق نہیں لیکن طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی رکھتے ہیں اور کنونشن میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنے ارادے سے بزم راولپنڈی کو جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

(۶) تمام بزموں کا فریضہ ہے کہ کنونشن کو ہر طرح کامیاب بنانے کے لئے مرکزی بزم اور بزم راولپنڈی کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ کنونشن تمام بزموں کا مشترکہ اجتماع ہے۔ اور بزم راولپنڈی ہم سب کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر لیا ہے۔

بزم طلوع اسلام۔ لاڑکانہ

نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پنڈال بعد نماز عید منظم طریقے سے تقسیم کئے تعلیم یافتہ طبقہ پر بہت اچھا اثر ہوا۔ بزم لاڑکانہ اپنے شہر میں ایک لائبریری قائم کر رہی ہے۔ جس کے لئے ادارہ

طلوع اسلام اور دیگر اسلامی تعلیمات پر معیاری کتابوں کی فراہمی کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

بزم لاڑکانہ کے سکریٹری تمام ہم مسلک حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کتابیں۔ طلوع اسلام کے پرانے پرچے یا ماہانہ طلوع اسلام بطور عطیہ ارسال کریں تو بہت شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ پتہ یہ ہے۔

ترجمان بزم طلوع اسلام

معرفت نظام الدین میمن وکیل۔ لاڑکانہ

ڈیرہ غازی خاں میں بھی بزم طلوع اسلام کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ مشتاق احمد چغتائی صاحب بزم کے ترجمان مقرر ہوئے ہیں۔

بزم سیالکوٹ کے ترجمان لکھتے ہیں کہ پروفیسر محمد الدین صاحب کے زیر نگرانی عربی کلاس جاری کر دی گئی ہے جس میں عربی جدید طریقے سے سکھائی جاتی ہے۔ آل ورلڈ مسلم کانفرنس اور اردو میں نماز کے پمفلٹ تقسیم کئے گئے جو عوام میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔

بزم پشاور کے ترجمان لکھتے ہیں کہ آل ورلڈ مسلم کانفرنس کے پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ بزم اپنے پروگرام کے مطابق باقاعدگی سے کام کر رہی ہے۔ بزم کے متعلق آئندہ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کی جائے۔

مرزا علی احمد صاحب، صدر بزم طلوع اسلام ۳۳۴ سکندر پورہ۔ پشاور شہر۔

سکریٹری مرکزی بزم طلوع اسلام

۱۲۵۔ خلیق منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی ۳

پیشگی خریداران

یہ سلسلہ سنہ ۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ گذشتہ چار سال میں اکثر و بیشتر زر پیشگی کے عوض مطبوعات ادارہ دی جا چکی ہیں اور متعلقہ کھاتوں میں یا تو کچھ باقی ہی نہیں رہا یا آمد سے خرچ اندھی ہو چکا ہے۔ مزید خرچ کی ادائگی کے لئے فرداً فرداً یاد دہانی کرائی جا چکی ہے۔

زر پیشگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابل قدر مدد ملی ہے اس لئے اس سلسلہ کا جاری رکھنا بہر وجوہ مستحسن ہے۔ توقع ہے کہ جن اصحاب کا زر پیشگی ختم ہو چکا ہے۔ وہ مزید ایک سو روپے یکمشت یا بالاقساط ارسال فرما کر اس مفید کام میں ضرور حصہ لیتے رہیں گے۔

قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جو تا حال پیشگی خریدار نہیں بنے ہیں۔ ان کی توجہ اس مفید سلسلہ کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اس میں جلد از جلد شامل ہو جائیں پیشگی خریدار بن کر آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں معتدبہ امداد بغیر کچھ خرچ کئے دیتے ہیں کیونکہ اس اسکیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک سو روپے کی رقم ادارہ کے پاس جمع کرا دیں۔ ادارہ

اپنی مطبوعات (جنہیں آپ لینا پسند کریں) آپ کو گھر بیٹھے پہنچ جایا کرے گا۔ اور محصول ڈاک بھی اپنے پاس سے ادا کرے گا اس طرح آپ کو آپ کے جمع کردہ روپے کی کتابیں (بلا محصول ڈاک) مل جائیں گی۔ اس میں ہمارا فائدہ صرف اتنا ہی ہے کہ ہمیں کچھ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی)
کراچی ۲۹

قائم شدہ ۱۹۰۵ء

اپنے کھانوں میں
لطف پیدا کیجیے

ہماری منتخب اجزاء سے تیار شدہ مصنوعات دعوتوں میں خاص طور پر پسند کی جاتی ہیں۔
آپ ان کی اعلیٰ ترین اور لطیف ترذائقہ کی وجہ سے دوسرے برانڈ کی مصنوعات پر بہت زیادہ ترجیح دیں گے۔

ہمارے

مربہ جات، بل جام، جیلی، ٹومیٹو کیچپ، چٹنی، کینڈیڈ پیلز، پکلس، اسکواشس۔ اپنی نظیر آپ ہیں۔

ایس۔ اے۔ رحمٰن اینڈ سنز
۴۲۔ عالی کالونی نمبر ۱۔ کراچی۔ ۵
فون نمبر ۴۰۰۸۴

برقِ طور

استبداد ملوکیت کے مجسمہ فرعون
پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کے
پیکر ہامان اور سرمایہ داری کی
خون آشامیوں کی تمثیل قارون
کے متحدہ محاذ کیخلاف صاحب ضرب
کلیم کی نبرد آزمائی اور بنی اسرائیل
کے عروج و زوال کی بصیرت افروز
اور عبرت انگیز داستان۔

قیمت مجلد چھ روپے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام کراچی

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے ہم ہر سال جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم نشان اور درد انگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

مزاج شناس رسول جنوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت۔ چار روپے

مقام حدیث (ہر دو جلد مکمل) حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ حدیث کی تاریخ، منکرین حدیث کون ہیں؛ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملینگی۔ ہر جلد تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور جماعت اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

نوادرات (از: علامہ اسلم جیراجپوری) علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسلامی معاشرت از: پرویز (تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات بالخصوص بچوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ قیمت دو روپے (محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ: **ناظم ادارہ طلوع اسلام** ۱۵۹/۲-ایل۔ (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) **کراچی** نمبر ۲۹

آغاخانی فرقہ

سر آغا خاں کی وفات کے بعد ہمارے پاس متعدد مقامات سے استفسارات آئے ہیں جن میں پوچھا گیا ہے کہ آغاخانی فرقہ کی تاریخ کیا ہے اور ان کے عقائد کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اس فرقہ کی تاریخ میں اکثر ادوار ایسے آتے ہیں جن کے متعلق کوئی معلومات یقینی طور پر ہم نہیں پہنچا سکتیں، اسی طرح ان کے عقائد کے متعلق بھی وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ وثوق سے انہی کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے جن کی کتابوں سے براہ راست ان کے عقائد معلوم کئے جائیں۔ لیکن یہ فرقہ اپنی کتابوں کو بڑی سختی سے رازمیں رکھتا ہے اور غیروں تک ان کی رسائی ناممکن ہے۔ غیر تو ایک طرف، خود ان کے متبعین میں بھی صرف خواص کو ان تک دسترس حاصل ہوتی ہے۔ اس فرقہ کو تو کہتے ہی باطنیہ فرقہ ہیں۔ اس لئے ان کی ہر بات باطن میں رہتی ہے۔ بنا بریں ان کی تاریخ اور عقائد کے متعلق کلی معلومات بہم پہنچانا مشکل ہے۔ اس قدم پر ہم نہایت مختصر الفاظ میں بیان کریں گے کہ ان کی تاریخ کیا ہے اور عقائد کیا؟ تاریخ کے متعلق تو خیر پھر بھی مختلف ماخذوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے عقائد کے متعلق کچھ زیادہ نہ کہہ سکتے اگر خود ان کے ایک قابل اعتماد متبع ڈاکٹر زاہد علی صاحب انتہائی جرأت اور ہمت سے کام لے کر ان کی تاریخ اور عقائد کے متعلق دو اہم کتابیں شائع نہ کر دیتے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ کتابیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو ہم اس باب میں شاید کوئی بات بھی وثوق اور اعتماد سے نہ کہہ سکتے۔

تاریخ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلا فرقہ شیعہ حضرات کا ہے (شیعہ کے معنی ہی پارٹی یا فرقہ کے ہیں) یہ ختم نبوت کے بعد امامت کے قائل ہیں اور امامت کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ اولاد میں بھی سب سے بڑا بیٹا، امام سابق کا جانشین ہوتا ہے۔ اس میں امام حسنؓ کے بعد امام حسینؓ کی استثنا ہے (شیعوں میں بعض فرقے امام حسنؓ کی مستقل امامت کے قائل نہیں) امامت کا یہ سلسلہ امام جعفر صادقؒ تک اسی انداز سے چلتا رہا۔ یعنی حضرت علی۔ امام حسن۔ امام حسین۔ امام زین العابدین۔ امام محمد باقر۔ امام جعفر صادق (علیہم الرحمۃ)

امام جعفر صادقؒ (جو اس سلسلہ کے چھٹے امام تھے) کے بڑے بیٹے امام اسمٰعیلؒ تھا جنہیں اول الذکر نے اپنا وصی مقرر کیا۔ اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جناب اسمٰعیل کی وفات امام جعفر صادق کی زندگی میں ہو گئی۔ جس کی وجہ سے امامت ان کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظمؒ کی طرف منتقل ہو گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جناب اسمٰعیلؒ کی ناسزدگی کے بعد امام جعفر صادقؒ کسی وجہ سے ان سے ناراض ہو گئے اور ان کی جگہ امام موسیٰ کاظمؒ کو اپنا وصی مقرر کر دیا۔ (ایک فرقہ کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ امام اسمٰعیلؒ فوت نہیں ہوئے۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور وہی امام قائم اور منتظر ہیں)

بہرحال پہلی دونوں روایتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد امام موسیٰ کاظمؒ مقرر ہوگئے۔ شیعوں کے جس گروہ نے ان کی امامت کو صحیح قرار دیا، انھیں اثنا عشری کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ حضرت علیؓ سے لے کر امام غائب تک بارہ اماموں کے قائل ہیں۔ ان کے برعکس دوسرے گروہ نے کہا کہ (امام) موسیٰ کاظمؒ کی امامت صحیح نہیں۔ امام برحق امام اسمٰعیل ہیں۔ اور انہی کی اولاد میں سلسلۂ امامت آگے بڑھے گا۔ یہ فرقہ اسمٰعیلیہ کہلاتا ہے۔ انھیں شش امامیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ (اثنا عشریوں کے عقیدہ کی رو سے) یہ صرف (حضرت علیؓ سے لے کر امام جعفر صادقؒ تک) چھ ائمہ کے قائل ہیں۔

آگے چل کر اسمٰعیلیہ کے بہت سے فرقے ہوگئے۔ جن میں سب سے اہم فرقہ نزاریہ ہے۔ اس فرقہ کا بانی حسن بن صباح ہے جو اپنی باطنی فدائی تحریک اور قلعہ الموت کی جنت، اور اپنی حشیش (بھنگ) کی وجہ سے تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ آغاخانی فرقہ اسی اسمٰعیلی نزاری باطنی فرقہ سے متعلق ہے۔

سر آغاخاں (مرحوم) کے آباؤ اجداد اٹھارویں صدی عیسوی میں ایران کی لبا طیاست پر اثر انداز دکھائی دیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں سر آغاخاں (مرحوم) کے دادا محمد حسن شاہ حسینی ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور اس کے بعد انھوں نے اور ان کی اولاد نے مستقلاً ہندوستان میں رہائش اختیار کرلی۔ یہ پہلے آغاخاں تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علی شاہ دوسرے آغاخاں ہوئے۔ اور مرحوم سلطان محمد شاہ تیسرے آغاخاں۔ اب ان کے پوتے پرنس کریم چوتھے آغاخاں ہیں۔ واضح رہے کہ آغاخاں امام یا پیر کی طرح کوئی مذہبی لقب نہیں بلکہ ایک عرف ہے جو چند پشتوں سے ان کے خاندان میں بزرگ خاندان کے لئے مخصوص چلا آرہا ہے (ان امور کی تصریح بمبئی عدالت عالیہ کے ایک جج جسٹس آرنلڈ نے سنہ ۱۸۶۶ء میں ایک مقدمہ کے فیصلے میں کی تھی۔ اس مقدمہ کے محرک بعض خوجے تھے جو آغاخاں سے منحرف ہوگئے تھے)

ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ہندوستان کے بوہرے بھی اسمٰعیلی نزاریہ کی ایک شاخ ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ان کا اول داعی عبداللہ تھا جسے خلیفہ مستنصر باللہ نے ہندوستان میں اسمٰعیلی تبلیغ کے لئے مامور کیا تھا۔ اب ان کے (ہندوستان میں) دو بڑے فرقے داؤدی اور سلیمانی ہیں۔ داؤدی فرقے کے موجودہ داعی، ملا طاہر سیف الدین ہیں۔

عقائد جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، اس فرقہ کے عقائد کے متعلق ہمیں تفصیلی طور پر کچھ معلوم نہ ہو سکتا اگر ڈاکٹر زاہد علی صاحب (سابق پروفیسر عربی اور وائس پرنسپل نظام کالج، حیدر آباد۔ دکن) اپنی کتاب "ہمارے اسمٰعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" میں یہ تفصیلات نہ دیتے اس کتاب پر ہم نے اگست سنہ ۱۹۵۴ء کے طلوع اسلام میں تبصرہ کیا تھا۔ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تبصرہ میں جو حصہ عقائد سے متعلق تھا اسے درج ذیل کر دیا جائے۔ ہم نے لکھا تھا:-

"ہم نے اس سے پہلے ان باطنی مذاہب کے متعلق جو کچھ کہیں سے ملا دیکھا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ کسی ایسے فرقہ کے معتقدات و تصورات ہو سکتے ہیں جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتا ہے۔ اپہلے ہمارا خیال تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اس کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ اس مذہب کے پیروؤں کے معتقدات

کیا ہیں۔ لیکن کتاب ختم کر لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اقتباسات دینے شروع کر دیئے تو کم از کم آدھی کتاب نقل کرنی پڑے گی۔ مختصر الفاظ میں سن لیجئے[1] کہ ان کے نزدیک (۱) لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہیں لا امام الا امام الزمان۔ (۲) قرآن کی آیت لو کان فیہما الھۃ الا اللہ لفسدتا میں اللہ سے اشارہ امام کی طرف ہے (۳) ھو اللہ الخالق البارئ المصور سے مراد عقل اول یا امام الزمان ہیں۔ (۴) عالم الغیب والشہادۃ سے مقصود مولانا قائم ہیں جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے۔ (۵) سورۂ اخلاص میں آنحضرتؐ اور آپ کے اہل بیت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ (۶) شرک کے معنی اللہ کیساتھ کسی اور کو شریک کرنا نہیں بلکہ ایک امام کی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے امام کی دعوت کو ملانا ہے۔ (۷) رسول اللہؐ کی حیثیت ایک مستودع کی ہے اور حضرت علیؓ مستقر۔ (۸) رسول اللہؐ کے بعد ایک ساتواں رسول پیدا ہوا تھا جو اس مذہب کا بانی (محمد بن اسماعیل) ہے۔ (۹) انبیاء تمام (مع رسول اللہؐ) کے گنہگار ہیں اور صرف ان کے امام معصوم ہیں۔ (۱۰) حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے ساتھ رسالت میں شریک تھے۔ (۱۱) حضرت علیؓ اور دیگر ائمہ کا رتبہ رسول اللہؐ سے چار درجے بڑا ہے۔ (۱۲) اذان میں اشھد ان محمد رسول اللہؐ سے ان کے مذہب کے اول امام محمد بن اسماعیل کی رسالت کی شہادت مراد ہے۔ (۱۳) قرآن کریم انجیل وغیرہ کی طرح محرف کتاب ہے (۱۴) شریعت اسلام ۱۳۳۳ھ میں ان کے امام اول کے ہاتھوں معطل ہو چکی ہے اور اب منقطع ہی رہے گی۔ (۱۵) اب مذہب کی بنیاد باطنی شریعت پر ہے جس کے رازدار ان کے ائمہ ہیں۔ (۱۶) قرآنی آیات کے معانی وہ نہیں جو ان کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو تاویل کی رو سے ان کے ائمہ نے کئے ہیں۔ ان تاویلات کی بڑی عجیب و غریب مثالیں درج کی گئی ہیں۔ (۱۷) امام سے اگر فواحش و منکرات کا بھی ارتکاب ہو جائے تو بھی اس کی امامت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ساری کتاب میں اسی قسم کے معتقدات کی تفاصیل اور ان کی مثالیں درج ہیں۔"

یہ ہیں مختصراً اس فرقے کے عقائد۔

ایک صاحب نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ (مولانا) احتشام الحق صاحب نے سر آغا خاں کے سوئم کی رسم کس نسبت سے ادا کی ہے۔ جواباً عرض ہے کہ یہ سوال احتشام الحق صاحب سے کرنا چاہیئے نہ کہ ہم سے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس سے زیادہ کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

ان صاحب کو غالباً اعتراض اس بات پر ہے کہ اس قسم کے عقائد رکھنے والوں کی رسم سوم میں شرکت (ہی نہیں بلکہ ادائیگی) چہ معنی دارد؟ لیکن ہم تو یہ ہی نہیں سمجھ سکے کہ یہ "رسم سوئم" مسلمانوں میں کہاں سے آ گئی؟ اللہ نے جو دین رسول اللہؐ کی وساطت سے انسانوں کو دیا تھا۔ اس میں تو اس کا نام نشان تک نہیں۔

---

[1] ہم یہ کچھ دل پر جبر کر کے نقل کر رہے ہیں اور فقرے فقرے پر معاذ اللہ کہتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں کہ نقل کفر کفر نباشد۔

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے

چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دوکان پر ملتا ہے